

”حضور۔“ اللہ وادنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اسی عقل کے کھونج میں اس کالج میں آیا تھا پر یہاں بھی نہیں ملی۔“

”اچھا لڑکو۔“ پرنسپل نے بات کا رخ بدلا۔ ”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اس پر چاروں طرف سے لڑکے بھاگنے بھاگنے آئے اور پرنسپل کے گرد جمع ہو گئے۔

”آج تم امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر جا رہے ہو۔ تم میں سے کئی لڑکے واپس اس کالج میں نہیں آئیں گے اسی لئے میں تم سب سے الوداع کہنے آیا ہوں۔“

اس پر سب لڑکوں نے تالیاں بجا گئیں اور پھر پرنسپل سے مصافحہ کرنے کے لئے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اس لشائی میں بنگالی پیر فٹڈنٹ بھی آگیا اور وہ دونوں باری باری لڑکوں سے ہاتھ ملانے لگے۔

### دو بھوڑے

پرنسپل کے جانے کے بعد بنگالی بابو کے کہنے کے مطابق وہ سب اپنا بستر بوریا باندھنے لگے اور پھر باری باری تالگوں میں پیٹھ کر رخصت ہونے لگے۔ ایلی کو بستر باندھتے دیکھ کر آصف نے چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”ایلی۔“ اس کی آواز میں منت تھی۔ ”تم چلے گئے تو میں کیا کروں گا۔ ایلی۔“

ایلی نے جیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب تو مجھے جانا ہی ہو گا۔“ وہ بولا۔

”کیوں یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے۔ تمہاری تسلیم بھی تو ہیں ہے۔“

”میری تسلیم۔“ ایلی چوڑکا لیکن جلد ہی سنجھل کر بولا۔ ”ہاں وہ۔“

”تو پھر تم کیوں علی پور جاتے ہو فضول۔ ہیں رہوا ایلی میرے ساتھ۔ یہاں نور ہے شبلگن ہے مہر ہے سمجھی تو یہاں ہیں۔ ہیں رہو میری خاطر۔ ایلی۔“

”لیکن یہاں رہیں گے کہاں۔ تمہارے گھر میں؟“

”نمیں تھیں۔“ وہ چلایا ”گھر میں میں کیسے جا سکتا ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہم یہاں کوئی مکان کرانے پر لیں گے۔“ آصف نے جواب دیا۔

ایلی امر تر میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ اسے آصف اور سفینہ کی کہانی میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ دلچسپی ہوتی بھی کیسے۔ اگر آصف اڑکی میں اشیائی دلچسپی محسوس کرتا۔ اگر وہ اسے ملنے کے منصوبے بامدھتا۔ اگر وہ اسے خطوط لکھنے اور وہاں تک پہنچانے کی ترکیبیں سوچنے کی فکر میں گھلتا اور ایلی سے ان امور میں مدد چاہتا۔ تو شاید ایلی کو اس رومان میں دلچسپی محسوس ہوتی۔ سفینہ سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے میں ایلی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن آصف نے انکار کرنا بھی تو ممکن نہ تھا اور وہ یہ بھی شہزادے کے قرب سے ڈرتا تھا وہ ان لگتی ہوئی گوری بانیوں سے ڈرتا تھا۔ جن میں بخشنے کی زبردست آرزو اس کے سینے میں سلگ رہی تھی۔

درحقیقت اس وقت وہ دونوں آصف اور ایلی ”بھگوڑے“ تھے اور ان کا وہ انوکھا فرار ان الجھنوں کا حامل تھا جو بندھنوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ وہ دونوں زندگی سے دور بھاگ رہے تھے۔ انسان کی بیادی خواہشات سے منکر تھے اور زندگی کے دھارے سے ہٹ کر کنارے کے بند اور متعفن پانیوں کے بھنور میں ڈیکیاں کھا رہے تھے۔ وہ بھگوڑے دراصل مریض تھے۔ جنہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں جنہیں شعور نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہاتھی کو ٹوٹانے والے دو اندھے۔

وہ چوبارہ جوانی میں رہنے کے لئے کرانے پر ملا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھا جو ہال بازار سے نکل کر رام باغ کے بازار میں جاتی تھی۔ اس گلی کی پچھلی منزل میں تمام تر دو کانیں تھیں جو سر شام ہی بند ہو جاتی تھیں۔ اور پر کی منزل میں زیادہ تر گودام تھے جو دن رات بند رہتے اس وجہ سے گلی ویران اور سفسان رہتی۔ لیکن ان کے

چو بارے کے جنگل کی کھڑکیوں کے عین مقابل ایک نوجوان رفاقت کی بیٹھک کا پچھلا حصہ تھا۔ بیٹھک کی کھڑکیاں رام باش کے بازار میں کھلتی تھیں۔ صدر دروازہ بھی اسی بازار میں تھا مگر..... پچھلے حصے کی کھڑکیاں اس چو بارے کے مقابل کھلتی تھیں۔

اس چو بارے میں وہ دونوں بے سر و سامان حالت میں جائیتے۔ ان کے پاس ایک ٹوٹے ہوئے ٹرنک اور دو بستروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے پاس انہوں نے زمین پر بستر بچھائے اور موم تیوں کا پیک و یا سلامی سگریٹ سر ہانے رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند ایک منٹ کے لئے وہ اس اجنبی ماحول کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔ ناموشی گردی ہوتی گئی امر گلی کی ویرانی اور اس کے عقب میں بازار کا دبا دبا شور خوناک صورت اختیار کرتے گئے۔ حتیٰ کہ رات کے اندھیرے نے اسے اور بھی بھیا نک بنا دیا۔

”ایلی۔“ آصف نے لمبی آہ بھری۔

”ہاں۔“

”اب کیا ہو گا؟“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اب میں کیا کروں گا؟ کیسے گھر جاؤں گا؟“

”تم تو خواہ خواہ ڈرتے ہو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو کیا گھر چلا جاؤں۔“ آصف نے پوچھا۔

”تمہارا اپنا گھر ہے۔“ ایلی بولا۔

”لیکن محلے والے کیا کہیں گے۔“

”پڑے کہیں تم نے کوئی جرم کیا ہے کیا۔“ ایلی نے چمک کر کہا۔

”لیکن میں اس سے نجات کیسے پاؤں گا؟“

”نجات پانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دیکھتی ہے تو پڑی دیکھے۔ تمہارا کیا لیتی

ہے۔ تمہارا کیا بگرتا ہے۔“

”سچ،“ آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اور کیا؟“ ایلی نے تن کر کہا۔

”اور اگر وہ آوازے کے تو؟“  
”تو کیا کرنے دو؟“  
”مگر اس کا انجم کیا ہو گا؟“  
”انجم اچھا چاہئے ہو تو اس پر یہ ظاہر کرو کہ تمیں اس ہے محبت ہے۔“

”لیکن کیسے ظاہر ہوں؟“

”تم اس کی طرف دیکھو۔“  
”بس اتنی سی بات ہے۔“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”اور کیا وہ مضمون ہو جائے گی اور تمہیں تگ نہ کرے گی۔“ ایلی نے وثوق سے کہا۔

”سچ۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“

”اس کے بعد آصف خاموش ہو جاتا اور کسی گھرے خیال میں کھو جاتا اور دریہ تک وہ دونوں چپ چاپ لیٹھ رہتے۔ پھر دفعتاً آصف چونکتا۔

”مگر ایلی،“ آصف مدھم آواز میں کہتا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ ”اس طرح توبات بڑھ جائے گی۔“

”ہاں بات تو بڑھ جائے گی۔“

”تو پھر کیا ہو گا؟“

”تو پھر.....،“ ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔

اگلے روز صح سویرے ہی آصف نے ایلی کو جگایا۔

”ایلی ایلی۔“ اس نے اسے جھنجوڑا۔ ایلی کے بیدار ہونے پر وہ مسکرانے لگا۔

کی آنکھوں میں عجیب سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ”ایلی“، وہ چلا یا۔ ”چلو میں تمہیں دکھاؤ۔ چلو اور پر کوٹھے پر۔“

”اوپر“، ایلی نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں“، وہ بولا۔ ”وہ کوٹھے پر کھڑی ہے۔“

”وہ.....؟ یہاں اس کوٹھے پر۔“

”اپنے گھر کے کوٹھے پر یہاں سے صاف نظر آتا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤ۔“

”لیکن وہ کون۔“ ایلی کو کچھ سمجھنی میں نہیں آزر باتھا۔

”بھئی وہی آؤتا۔“

”وہی تمہارے والی سفینہ۔“

”ہاں ہاں وہی۔ کوٹھے سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ہے۔“

”لیکن تمہارا محلہ تو دور ہے یہاں سے۔“

”نہیں تو اس چوبارے کے عین پچھواڑے میں ہے۔ یہاں بازار کے پیچے اس کشوے کے باہمیں ہاتھ۔“

”لیکن....، ایلی کو یقین نہ آتا تھا۔“

”راسٹہ گھوم پھر کر جاتا ہے ویسے یہاں سے قریب ہے چلو نا۔ بیچاری کھڑی میری راہ دیکھ رہی ہو گی ابھی تک ہمت نہیں باری، حالانکہ مجھے گھر سے نکلے اتنی دیر ہو چکی ہے۔ حد کر دی اس نے یہ تو میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔“

کوٹھے سے ایلی نے اس طرف نگاہ دوڑائی جدھر آصف اشارہ کر رہا تھا۔

چاروں طرف منڈیروں کوٹھوں اور چھتوں کا ایک طوفان پھیلا ہوا تھا اور وہ منڈیریں اور چھتیں ایک دوسرے سے شانے جوڑ کر کھڑی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کا سہارا

لے رہی ہوں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے مکانات مسماں ہونے کے بعد ملے کے ڈھیر بن گئے ہوں اور ان ڈھیروں میں چند بالائی سے چل پھر رہے ہوں۔

”وہ دیکھو وہ“ آصف شرما تے ہوئے بولا۔ ”وہ جو نیلی بر ساتی کے پاس زرد رنگ کی منڈریوں والی چھت نہیں اور اسی کے قریب ملیے سے کوٹھے پر وہ جس کے پیچھے بڑے بڑے سوراخ ہیں دیوار میں ان پر دوں کے پاس وہ سفید کپڑوں میں مابوس لڑکی ہے نا آئی نظر بس رہی ہے۔ دیکھا۔“

غور سے دیکھنے کے باوجود ایلی کو چھتوں کے انبار کے سوا نئے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن آصف کے اصرار سے بچنے کے لئے اسے کچھ دری کے بعد ”ہاں ہاں..... وہ“ کہنا ہی پڑا۔

”اب دیکھ لو۔“ آصف بولا۔ ”یوں کھڑی رکھتی ہے جیسے پھر کا بت کھڑا ہو۔“

”ہاں۔“ ایلی بولا۔ ”تم نے تو اسے پھر کا بنا دیا۔“

”جی،“ آصف نے مسکراتے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”وہ بھی یہی کہتی ہے۔“

”جی کہتی ہے وہ۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تم بھی یہی سمجھتے ہو کیا۔“ آصف نے آہ بھر کر پوچھا۔

”تم اسے خواہ نہ کوہ اتباہ و بر باد کر رہے ہو آصف۔“ ایلی غصے میں بولا۔

”میں؟“ آصف نے مظلوم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں تم۔“ ایلی چلا یا۔

”نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔“ آصف نے منٹ کی۔

”اے تم سے محبت ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”اسی لئے تم اسے ذلیل کر رہے ہو۔“

”کیا واقعی محبت ہے اے؟“ آصف نے پوچھا۔

”ظاہر ہے اور کیا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا مقصد صرف مجھے بدنام کرنا ہے۔“

”تم پاگل ہو آصف۔“

”کیوں؟“ وہ چلا یا۔

”کیا اس طرح وہ خود بدنام نہیں ہوتی۔“

”اے بدنامی کی پروانیں۔“

”دڑ کی ہو کر بدنامی کی پروانیں؟ لتنی عجیب بات کرتے ہو تو۔“

”ہاں عجیب ہی ہی معلوم ہوتی ہے۔“ آصف سوچ میں پڑ گیا۔

اس قسم کی بے ڈھنڈی کاریں کرتے کرتے دنھنگا وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

آصف نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتا اور ایلی کا بھی چاہتا کہ اس کا بھی کوئی انتظار کرے اس کے لئے بھی کوئی چھت پر کھڑی رہے حتیٰ کہ صبح سے شام ہو جائے۔ اس کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کو ٹھکرانے کے لئے بے تاب تھا۔

پھر دفعتاً ایک دھندلی سی شکل ایلی کی نگاہوں تلنے واضح ہونے لگتی۔ دو سفید بانیں لٹکتیں۔ دو شکر فی ہاتھ بڑھتے اور مانٹھے کے عین درمیان میں ایک سیاہ تل ابھر آتا۔ شہزاد مسکراتی اور کہتی ”میں تم کیا تم دنیا والوں کی پروا کرتے ہو؟“ اس وقت ایلی خاموش ہو جاتا اور آصف کی آواز سن کر چونک پڑتا اور اس کا وہ حسین خواب ٹوٹ جاتا۔

اس طرح ایک دوسرے سے دور ایک دوسرے سے بیگانہ وہ دونوں قریب قریب بیٹھ رہتے اور دیوانوں کی طرح اس اجڑے ہوئے منڈروں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے رہتے۔

ایک روز آصف بولا۔ ”ایلی کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا کہ وہ جھوٹی ثابت ہو جائے اور میں اسے طعنہ دے سکوں۔“

ایلی کو بات سمجھ میں نہ آئی۔ ”میں نہیں سمجھا۔“ وہ بولا۔

”مطلوب یہ ہے کہ میں اسے کوئی ایسی فرمائش کروں جو وہ پوری نہ کر سکے اور پھر میں اس سے کہوں لیں و میکھلی تمہاری محبت۔“

”یہ تو سیدھی نہادھی بات ہے۔“ ایلی چلایا۔ ”اسے کہہ کہ یوں اعلانیہ تم سے اظہار محبت نہ کرے۔“

”اوہ ہوں“ اصف نے نقش میں سر بلایا۔ ”یہ وہ نہیں مانتی۔ کوئی اور بات ہو۔“

”کوئی اور بات۔“ اینی شوق تباہ پڑا گیا۔ ویری تک وہ دونوں خاموش رہے پھر دھڑا ایلی نے چنکلی بجائی۔ ”بین گئی بات۔“

”کیا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے بہتر تجویر نہیں ہو سکتی۔“ ایلی نے خوش سے اچھل کر کہا۔

”کیا تجویز ہے؟“ آصف شوق سے ایلی کے قریب تراہو گیا۔

”لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے تمہیں گھر جانا پڑے گا۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ آصف بولا۔ ”میں چلا جاؤں گا۔ بتاؤ تو۔“

”جب تم گھر جاؤ تو کوٹھے پر چلے جانا۔“ ایلی نے گر مجوشی سے کہا۔

”گھر جاتا ہوں تو کوٹھے پر تو ضرور جالیا کرتا ہوں اگر چہ لوٹا لے کر جاتا ہوں۔ ویسے ہی وکھانے کو۔“ آصف بولا۔

”اور وہ کوٹھے پر آ جائے گی۔ آ جائے گی نا۔“

”ہاں۔ وہ تو اکثر کوٹھے پر ہی رہتی ہے اور مجھے دیکھتے ہی اعلانیہ سلام کرتی ہے جھک کر بڑے ادب سے۔“ آصف ہنسنے لگا۔

”اب کی مرتبہ وہ سامنے آئے تو اسے اشارہ کر کے اپنی قُمیض کے نچلے کونے کو

پکڑ کر اور پاٹھانا۔ بیہاں تک کہ بازو سر کے اوپر انگڑائی کی صورت معلق ہو جائیں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے قمیض کا اگلا حصہ اوپر اٹھ جائے گا۔“

”پھر؟“ آصف اس کے قریب تر ہوا گیا۔

”پھر تمہارا سارا جسم نگاہو جائے گا۔“

”لیکن اس کافا نہ ہے۔“

”پھر اسے اشارہ کرنا کوئہ بھی ایسا ہی کرے۔ اشارے سے کہنا میری خاطر۔“

”یوں کرنے سے تو اس کا جسم بھی نگاہو جائے گا۔“ آصف گھبرا کر بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے تخرے کہا۔

”لیکن وہاں کوٹھے پر اسے نگاہ دینا۔“ آصف چکچا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔“

”یہی تو بات ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ عورت ہے۔ حیا مانع ہو گی۔ وہ مجبور ہو گی اور تمہاری فرمائش پوری نہ کر سکے گی۔“

”ہوں۔“ آصف بولا۔ ”لیکن اگر اس نے قمیض اٹھا دی تو.....“

قمیض اٹھا دی تو..... ایک ساعت کے لئے ایلی گھرا گیا اس نے اس امکان پر غور ہی نہ کیا تھا پھر وہ بولا۔ ”نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی خصوصاً کوٹھے پر کھڑی ہو کر ایسا نہ کر سکے گی پھر تم تخرے سے نہ دینا بس یہی ہے تمہاری محبت۔“

”لیکن تخرے سے کس طرح ہنسوں گا میں۔“ آصف نے پوچھا۔

”جیسے تخرے ہستے ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”پھر وہ دونوں تخرے ہٹنے کی کوشش کرنے لگے۔“

## سنگ مرمر کا مجسمہ

اگلے روز صح سویرے ایلی نے بصد مشکل آصف کو گھر جانے پر مجبور کر دیا تا کہ وہ گھر جا کر اس کی نئی تجویز پر عمل کر سکے۔ نئی تجویز پر عمل کرنے کے لئے آصف گھر جا

چکا تھا اور ایلی رعمل کی تفصیلات جاننے کے لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لڑکی آصف کے کہنے پر اپنی قمیض نہیں اٹھائے گی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے عریاں نہیں کرے گی۔ مگر دنعتاً اس کا نسلسلہ خیالِ نوٹ جاتا اور دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ وہ قمیض اٹھائے تاکہ آصف واپس گھر جانے پر مجبور ہو جائے اور اس ویران چوبارے میں رہنے سے نجات مل جائے۔ پھر وہ لا حول پڑھنے لگتا اور اسے احساس ہوتا کہ وہ کہینے ہے جو اپنے فائدہ کے لئے آصف کو گھر جانے پر اکسماں ہا ہے۔ پھر وہ چلا اٹھتا۔ ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہو گا۔“

اس نے اپنے پیچھے آہٹی ہے تھی۔ آصف، وہ چلا یا۔ ”تم آگئے۔“ آصف ایک بُت کی طرح اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ لز رہے تھے۔ بازوں لگ رہے تھے۔

”آصف،“ ایلی اس کی طرف مڑا۔ ”کیا ہوا آصف؟“

آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

”لیکن وہ۔ وہ۔ وہ رک گیا۔“ وہ لڑکی۔

آصف نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔

”اس نے کیا کیا بولا۔“ ایلی اضطراب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

”آصف نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کا سرا ایلی کی چھاتی پر لگ گیا۔

”خدا کے لئے بولو۔“ ایلی چلا یا۔

”ہاں اس نے قمیض اٹھا دی۔“ آصف زیر لب بولا اور اس کے گالوں پر دو موٹے موٹے آنسوؤں حلقہ آئے۔

”بالکل ہی اٹھا دی؟“ ایلی نے دیوانہ وار پوچھا۔

”ہاں۔ بالکل۔“

”پھر؟“ ایلی کاسر بھڑ کے ڈنک کی طرح بھن بھن کر رہا تھا۔

”ڈر سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔“ آصف نے جواب دیا۔ ”اور میں

بھاگا کہ کوئی مجھے وہاں دیکھنے لیے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ ویسے یہ کھڑی تھی جیسے سنگ مرکا کوئی مجسمہ ہو۔ نہ کہا مجسمہ۔“

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ایلی تسلی سے زمین کریدنے لگا اور آصف دیوار سے سہارا لگا کر کھڑا ہو گیا اس کی آنکھوں سے آنکھ بہر رہے تھے۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

”ایلی۔“ دیر کے بعد آصف گلتگیا۔

”ہاں۔“ ایلی چونکا۔

”اس کا جسم اتنا خوبصورت.....“ شدت جذبات سے آصف کی آواز رک گئی۔

”آصف۔“ دفعتاً ایلی اٹھو بیٹھا۔ ”تم اب جاؤ۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں کوئی نہیں۔“

”ایلی۔“ آصف چلا یا۔

”اب تمہیں جانا ہی ہو گا۔ میں شام کی گاڑی سے علی پور جا رہا ہوں۔“

”ایلی۔ ایسا نہ کرو۔“ آصف نے منت سے کہا۔ ”میں تباہ ہو جاؤں گا۔“

”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”اب تمہیں اسے اپنانا ہی ہو گا۔“ اور وہ نیچے اتر کر سامان باندھنے لگا۔

”ایلی.....“ آصف نے آخری بار اسے پکارا۔ لیکن وہ زینہ میں پہنچ چکا تھا۔

”اگر تم سیدھے گھرنے کے آصف تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گا۔“ یہ کہہ کر ایلی گلی

میں اتر گیا۔

آصف نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور دیکھا رہا حتیٰ کہ وہ نظروں سے او جھل ہو گیا۔



اس روز آصفی محلے کی طرف جاتے ہوئے ایلی پہلی مرتبہ لوگوں کی نظر میں بچا کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اگرچہ طبعی طور پر وہ لگا ہوں پرچہ ہنسنے سے گھبرا تھا لیکن محلے کی اور باتیں تھیں۔ محلے میں وہ اہمیت محسوس کیا کرتا تھا۔ جب وہ محلے کے کسی اڑکے کی آواز سنتا!

”آگے بایو جی۔“

تو خوشی کی ایک بہر ور جاتی۔

محلے کے بازار میں سب سے پہلے حکیم بٹالی دوکان تھی۔ بوٹے کے انداز میں سمجھیں کی سی ترشی تھی۔ وہ ہمیشہ طنز بھری بات کرتا۔ لیکن ایلی کو بری نہیں لگتی تھی۔ بوٹے کے بعد چاند حلوائی کی دوکان تھی ایلی کو دیکھتے ہی اس کے زر دوانت باہر نکل آتے۔

”آگے بایو جی۔ نہستے مہاراج۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیتا۔

اس روز نہ جانے ایلی کو کیا ہوا تھا۔ ان جانے میں وہ چھپ چھپ کر گھر جا رہا تھا۔ کہیں حکیم نہ دیکھے پائے۔ چاند دکان پر موجود نہ ہو۔ چاند اور حکیم کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ رات پڑھ کی تھی۔ لوگ دکانیں ہڑھا چکے تھے۔ بہر صورت نخوت مبارک فروش کی دکان پر حسب معمول جھمگھا تھا اور وہ سب اندر بیٹھے ہوئے چوپٹ کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ پھر منہ دوسری طرف موڑ کر چکے سے آگے نکل گیا۔ نخوت کی دکان کی مشکل تو حل ہو گئی اب سردار دو دھواں کی دکان سے گزرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس روز اس کی دکان پر کوئی بھی نہ تھا۔ نیچے خالی پڑا تھا جس پر محلے کے لوگ اکثر دیر تک بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپ بانکا کرتے تھے۔ سردار خود بازار کی طرف پیٹھ کئے دو دھواں کی کڑا ہی صاف کر رہا تھا۔

مسجد کے قریب پہنچ کر ایلی شاہ ولی کی خانقاہ کی چار دیواری کے سامنے میں چلنے لگاتا کہ مسجد سے آتا ہوا کوئی بزرگ اسے نہ دیکھے۔ چوگان ویران پڑا تھا جس کے اوپر محلے کی کھڑکیاں یوں ٹھما رہی تھیں جیسے قبرستان میں یہاں وہاں دیئے جل رہے ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ وہاں رکا اور پھر ایک ہی جست میں چوگان کو پا کر کے چھتی گلی میں جا گھسا۔ اتنی رات گئے فرحت کے گھر کی اندر ہیری ڈیورٹی سے گزرا تو ممکن نہ تھا کیونکہ وہ دروازہ تو گھروالے سر شام ہی بند کر لیا کرتے تھے۔ شہزاد کی طرف سے جانتے ہوئے وہ ٹھبرا تھا کیونکہ شہزاد کے چوبارے کی چلی منزل میں سعیدہ رانی تھی اور سعیدہ کے سامنے اولپڑا جانا، یہ اسے کوارانہ تھا۔ سعیدہ کیا کہے گی۔ منہ سے نہ بھی کہے تو دل میں کہے گی۔ اللہ کر کے سعیدہ کا دروازہ ٹھلا ہوتا کہ اسے ٹھکٹھانا نہ پڑے۔

دروازہ ٹھلا دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چند ایک ساعت کے لئے چلی منزل کا جائزہ لینے کے بعد وہ سامنے کی طرح لپک کر اوپر کے زینے میں جا پہنچا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہ سیڑھیاں نہ جانے کتنی دیر میں طے کیں تاکہ سعیدہ یا شہزاد کو پاؤں کی چاپ سنائی نہ دے۔

سیڑھیوں میں چھپ کر اس نے ایک نگاہ شہزاد کے چوبارے پر ڈالی۔ چوبارے کے دروازے کے عین درمیان میں ایک چوکی پر سلائی مشین رکھے وہ کچھ سینے میں مصروف تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سیاہ تاروں والا دوپٹہ ایک شان بے نیازی سے اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ سیاہ دوپٹے میں اس کا سفید چہرہ کسی انجامی مسرت سے چمک رہا تھا۔ سیاہ سرگلیں آنکھیں دو آڑی تر چھپی قندیلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور ماٹھے کے عین درمیان میں سیاہ تلک آویزاں تھا۔ آڈھی آستینیوں والے بھرے بھرے بازو مشین پر لٹک رہے تھے۔

شہزاد کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھک سے رہ گیا۔ ایلی نے محسوں کیا جیسے وہ

سنگ مرمر کا مجسمہ ہو۔ جیتا جا گتا مجسمہ۔ وہ ایک سپنا تھی۔ سندر سپنا۔ ایسا سپنا جس کی تعبیر کے متعلق اسے خود بھی علم نہ تھا۔

آہستہ آہستہ شہزادی کی طرف بڑھا اور پچپے سے آنکھ بچا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور پھر اس کے لکھتے ہوئے بازوں کو گرفت میں لے کر دیوانہ وار چونے لگا۔  
شہزادی سے دلکش کر دی گئی۔

”ہائے تم ہو۔“ وہ چلائی۔ ”تم نے تو مجھے لے را دیا۔“  
ایلی نے اپنا منہ اس کے گورے پاؤں میں گاڑ دیا۔  
”یہ کیا حماقت ہے۔“ وہ اسے گھوڑے لگانی لیکن اس کی شیریں آواز میں مسکراہٹ کی واضح جھلک تھی۔ جیسے تیوری محض وظیفہ ادا ہو۔  
”یہ کیا پگلاپن ہے۔“ شہزادی نے اسے گھوڑا۔  
”ہے پھر۔“ وہ بولا۔ ”کرو جو کرنا ہے۔“

وہ نہس پڑی۔ ”اب پا گلوں سے کون لڑے۔“  
”لڑ کر دیکھ لو۔ اگر ہمت ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔  
”اوہہوں۔“ شہزادی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”چپ رہ.....“  
”کون ہے۔“ ایلی گھبرا لٹھا۔ ”کون ہے؟“

”جانو۔“ وہ زیریں بولی اور اس نے صحن کے پرے کوئی کی طرف اشارہ کیا۔  
”وہ ابھی آجائے گی میں نے اسے گھر کا کام کرنے کے لئے پاس رکھ لیا ہے۔“  
ایلی کی تمام تر مسرت مفقود ہو گئی اور وہ چپ چاپ یوں بیٹھ گیا جیسے اس شہزادی کی آڑی ترچھی آنکھوں اس کے سیاہ دوپٹے اور گورے بازوؤں سے کوئی تعلق نہ ہو۔  
”آخر آہی گئے تم۔“ شہزادی زیریں بولی۔  
”آن آہی پڑا۔“ ایلی نے کہا۔

”اور جو اتنی دیر وہاں ٹھہرے رہے۔ امتحان کے بعد وہ.....“ شہزادی مسکرائی۔

”میلو..... جواب دو۔“

”تم نے جو کہا تھا۔ میں شکایت کر دوں گی۔ یاد ہے کہا تھا نا۔“ ایلی نہ سا۔

شہزادے مسکرا کر سرا اشبات میں ہلا دیا۔

”جھوٹ کہا تھا کیا۔“ وہ آنکھیں چمکا رکبوں۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے روپ رو دو شمعیں روشن ہوئی ہوں۔

وہ نگاہ اس کے لئے ایک نئی چیز تھی جس میں چمک کے علاوہ عجیب سی گرمی تھی جس کے زیر اثر اس سے خون میں حدت پیدا ہو جاتی تھی پہنچیاں حرکت کرنے لگتیں۔ آنکھوں میں خمار لد آتا اور ملکیں اور جمل ہو کر بھاک جاتیں۔ اس ایک نگاہ سے ایلی نے محسوس کیا جیسے گرفوپیش کو ایک شہر کے وضنکے نے پیٹ میں لے لیا ہو۔ جیسے تمام کائنات منور ہو گئی ہو۔ جیسے زندگی نے ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ وہ اس ایک بے پایاں نگاہ کے نشے میں سرشار نہ جانے کب تک بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ جانو باتھ میں لفڑا لئے باہر نکلی اور اسے دیکھ کر چلا۔

”ایلی ہے۔ کب آیا ہے۔ کیا سکول چھوڑ دیا یا ویسے ہی چھٹی پر آیا ہے۔ اے ہے بولتا نہیں۔“ وہ پنجے جھاؤ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”میولتا تو ہوں۔ کیا کہتی ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔

”کہاں بولتا ہے تو جیسے مدھک پی رکھی ہو۔ آنکھیں تو دیکھا پنی۔“ جانو نے نہ کر کہا۔

ایلی کو بات نالنے کی ترکیب نہ سو جھی، بولا۔ ”تجھے دیکھ کرنہ جانے کیا ہو گیا ہے آنکھوں کو۔“

”کسی کی جرأت ہے کہ میری طرف دیکھے۔“ وہ غرائی۔ ”ویدے نہ پھوڑ دوں۔ آج تک تو جرأت نہ ہوئی کسی کو میری طرف دیکھنے کی۔“

شہزادے کی آنکھوں میں پھوار پڑنے لگی۔ وہ ہستے ہوئے بولی۔ ”یہ تو دیکھ رہا ہے

روک لے اسے ورنہ سرچ چڑھ جائے گا۔ بات بڑھ جائے گی۔“

”ہوں۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ”یہ کیا سرچ چڑھے گا۔“

”ناک نہ چڑھا جانو۔“ ایلی قہقہہ مار کر بولا۔ ”پہلے ہی تیری ناک تکوار کی طرح تیز ہے۔“

”لے کر لے بات۔“ شہزادے نے پھر وہی نگاہ ایلی پر ٹالی۔

”دفع کران آج چل کے چھوکروں کو۔ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ گھرے کے پرے کونے کی طرف چل پڑی اور بڑا بڑا ہوئی کام میں مصروف ہو گئی۔

شہزادے نے پھر وہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ ہوتاؤں میں نہ جانے کیسی مقناطیسی جنبش پیدا ہوئی اور پیشانی کا تلک دفعتاً منور ہو گیا۔ ایلی کے دل میں نہ جانے کیا ہونے لگا۔ اس کے جسم سے چل جھری کی طرح انگارے نکلنے لگے۔

ایلی کا سرشاریوں پر بھن بھن کر رہا تھا۔ شہزادیوں انہاک سے سوئی میں تا گا پرو رہی تھی جیسے احساس ہی نہ ہو کہ پاس کوں بیٹھا ہے۔ ایلی کی نگاہوں تک شہزادے کے سر کے گرد ایک سنہری ہالہ چمک رہا تھا۔ دور جانو نہ جانے کیا بڑا بڑا رہی تھی۔

اس روز ایلی کو اپنی گرزشی زندگی ایک وہنداخواب محسوس ہونے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ازسرنو پیدا ہوا ہو۔ شہزادے کے بطن سے پیدا ہوا ہوا اور ایک نئی زندگی سے نوازا گیا ہو۔ جیسے اس نے زندگی کا پہلا موڑ طے کر لیا ہوا اور اس کے طے کرتے ہی زندگی کی شکل ملیتہ بدلتی ہو۔ اتنی سی بات نے اس کی زندگی بدلت دی تھی۔ صرف اتنی سی بات کہ اس نے دو لکھتے ہوئے بازوؤں کو تھام لیا تھا اور خفتے سے بچنے کے لئے محبت کا ڈھونگ رچالیا تھا۔ زندگی کس قدر عجیب تھی اور وہ زندگی کا موڑ کس قدر حسین تھا۔

نہ جانے شہزاد کو کیا ہے۔ ایلی سوچنے لگا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اس قدر قریب آ جاتی ہے کہ نوں میں تھرکتی محسوس ہوتی ہے۔ پہلو میں دھڑکتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ گرمی کی روکی طرح بند بند میں رینگتی ہے اور کبھی یوں دیکھتی ہے جیسے کوئوں دور ہو۔ جیسے اسے ایلی کے وجود کا بھی شعور نہ ہو۔ احساس ہی نہ ہو کہ ان دونوں میں کوئی بندھن ہے۔

صرف نگاہ ہی نہیں اس کی خاموشی بھی ایسے ہی اثرات کی حامل تھی۔ کبھی وہ آنکھیں جھکا کر کام میں لگ جاتی تو کبھی ایلی کو محسوس ہوتا جیتے وہ اس پر جھکی ہوئی ہو جیسے اس کے جسم کی گرمی اُنھے پچھا رہی ہو۔ جیسے اس کا زرم و گداز جسم اس سے مس ہو رہا ہو۔ مگر کبھی جب وہ آنکھیں جھکا کئے کام میں مصروف ہوتی تو گویا وہ برف کا ایک تو دہ بن جاتی۔ اس کے انگ انگ سے بیگانگیت کی لہریں نکلتیں اور ایلی کو مجید کر دیتیں۔ اور وہ اضطراب اور گھبراہٹ سے پہلو بد لئے لگتا۔ نہ جانے یہ خصوصیت صرف شہزاد میں ہے یا کبھی عورتوں میں ہوتی ہے..... بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا کیا سبھی عورتوں کے کئی ایک روپ ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب آن میں را دھا بن جاتی ہیں۔ اسے کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا۔ جب شہزاد سے قرب کا احساس حاصل ہوتا تو ایلی کے لئے سانس لینا بھی پر لذت ہو جاتا لیکن جب وہ بیگانگیت کا روپ دھارتی تو ایلی کے دل میں از سر نواحاس مکتری جاگ اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے آپ کو کوستا۔

”اب تو چائے پے بغیر نہ جائے گا کیا؟“ جانو نے اس کے قریب آ کر کہا۔  
وہ چولنا۔

”تو ابھی تک نہیں ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر جانوسر ہلانے لگی۔  
”تو کیا چلی جاؤں۔ اچھی نہیں لگتی تجھے۔“

”نہیں نہیں۔ اچھی لگتی ہے تو۔“ ایلی نے پینتر ابلہ۔ ”بہت اچھی لگتی ہے۔“

”نہ مجھے نہیں اچھا لگتا یہ مذاق۔“ جانوبولی۔

”تجھ سے نہ کرے تو کس سے کرے مذاق۔“ شہزادے کہا۔

”کیوں۔ کیامان بہن ہے کرے کانداق بیج ہے آخر پیٹا کس کا ہے۔ علی احمد کا ہی ہے نا۔“

”کیوں۔“ وہ چمک کر اولاد۔ ”علی احمد نے کیا کیا تھا مذاق۔“

جانو کالیاں دیئے گئی۔

”شرم نہیں آتی جو منہ میں آیا بیک دیا۔“

”تو پلا دے اسے چائے تو خاموش ہو جائے گا۔“ شہزادے دیئے ہی ہے پرواہی سے کہا۔ اور جانو چائے بنائے گئی۔

جانو عرصہ دراز سے آ صفائی محلے میں مقیم تھی۔ وہ آ صفائی نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں سے تھی جو باہر سے آ کر محلے میں رہنے لگے تھے۔ جانو کا خاوند عرصہ دراز سے فوت ہو چکا تھا۔ اور اب دونوں ماں بیٹی کا گزارہ محلے والوں کا کام کا ج میں ہاتھ بٹانے پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ آمدی نہ تھا۔ کام کا ج نہ بھی ہوتا تو بھی محلے والے جانو کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔

جانو کا رنگ کھلا کھلا تھا۔ نقوش ستواں تھے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ جوانی کے دنوں میں بے حد حسین ہو گی۔ اگر چہاب اس کے حسین نقوش پر ضبط کی کرختگی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ محلے والے جانو کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ نوجوانی میں یہ وہ ہو جانے کے باوجود اس نے اپنی تمام زندگی پا کیا تھی میں گزاری تھی۔ محلے میں کسی شخص نے کبھی اس پر انگلی نہ اٹھائی تھی۔ محلے والے اس کی شرافت کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے اور جانو اپنی اہمیت کا احساس اس پاک دامانی سے اخذ کرتی تھی اور اسی وجہ سے ہر کسی سے پاک دامنی کا مطالبہ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی آواز

میں کرختگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے مزاج میں درشتی اور لا ابالت تھی۔ محلے کے لوگ اس کی سخت مزاجی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ خصوصیات انہوں نے بذات خود اس میں پیدا کی تھیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار سے جانو پر عائد کر دیا تھا کہ وہ کسی سے ملامت اور انتہا سے بات نہ کرے کیونکہ اس کی تمام تر عظمت اجتناب پر قائم کی جا چکی تھی۔ بہر حال جانو کو یہ احساس نہ تھا کہ لوگوں نے اس کے متعلق ایک رائے قائم کر کے دراصل اسے زندگی کے اثباتی پہلوؤں سے محروم کر دیا ہے۔

چونکہ جانو کی تمام تر اہمیت ”وامن تر مکن ہشیار باش“ پر ہے تھی اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ ”وامن تر مکن ہشیار باش“ کی تلقین کرنے کے لئے دنیا میں بھی گئی ہے۔ اپنی تمام تر زندگی کو سنوارنے کے بعد اب وہ دوسروں کی زندگی کو سنوارنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اسی وجہ سے ہر جوان اڑکی یا میا رحیمہ کو بات بات پر ہدایت کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی عادت کی وجہ سے محلے کی بوڑھیاں اسے بہت اچھا سمجھتی تھیں اور محلے کی جوان عورتیں اس کی آمد پر حفاظت ہو جاتی تھیں۔ اور ایسا برداشت اختیار کر لیتیں کہ وہ زیادہ دیران کے پاس نہ ٹھہرے لیکن ان واضح اشارات کا جانو پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان خصوصیات کو رکاوٹ سمجھتی جن پر اس کی اہمیت کا تمام تر دار و مدار تھا۔

### مطعون مجبوبہ

شہزاد محلے کی فضا میں پل کر جوان نہ ہوئی تھی اس لئے وہ محلے کی رسومات اور آصفی برداشت کی تفصیلات سے نہ تو واقف تھی اور نہ نہیں اہمیت دیتی تھی۔ وہ طبعاً ان تفصیلات سے بے نیاز تھی اور اپنی طبیعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی قابل تھی۔ شہزاد کو کبھی نہ سوچھی تھی کہ ماحول کا تقاضا کیا ہے۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کیا اندازہ لگائیں گے۔ وہ لوگوں کی اہمیت کا شعور ہی نہ رکھتی تھی۔

رکھتی بھی کیسے اس کے اپنے میاں برائے نام ہی نہیں بلکہ طبعاً شریف واقع ہوئے تھے اور شریف خاوند اسے کہتے ہیں جو بیوی کی ہر بات پر سرتلیم خم کر دے۔

شریف نے سرتلیم خم کرنے کا ایک انوکھا بہانہ ایجاد کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ عشق حقیقی میں ڈوب کر اسے کبھی بات میں دچکپی نہ رہی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ دنیاوی باتوں پر غور کر سکے۔ اگر چہ شہزاد کا حسن دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہراتی تھی اور رہنماؤں سے لعب پہنچنے لگتا تھا لیکن وہ تو قطعی طور پر اور بات تھی۔ دچکپی کے اس فتقدان کے علاوہ شریف کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو شہزاد کے دل میں اس کی عظمت کا احساس پیدا کر لیں اور شریف کی خوشنودی کے لئے ذاتی محسوسات کے چکر سے نکلنے پر مجبور کرتی یا شریف کو جنتے پر ابھارتی۔ وہ تو شہزاد کی آمد سے پہلے جیتے جا چکے تھے اس حد تک جیتے جا چکے تھے کہ انہیں ازسرنو جیتنے کی کوشش سراسر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر چہ ظاہروہ یہ ظاہر کیا کرتے کہ وہ انور کے حادی ہو چکے ہیں مگر وہ محض ایک دل بہلا وہ تھا۔ درحقیقت وہ طبعاً سر جھکا دینے کے حادی تھے اور عرصہ دراز سے عملی طور پر شہزاد کے سامنے سر جھکا چکے تھے۔

ان حالات میں شہزاد کو اپنی ذات سے بہت کرسو چنے یا سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے آ صفحی محلے میں آ جانے کے باوجود وہ محلے کے تقاضوں سے بے نیاز رہی۔ محلے والوں کو دیکھ کر اس نے کبھی دو پہے یا لگا ہیں سنjalانے کی کوشش نہ کی۔ بات کرنے سے پہلے کبھی نہ سوچا کہ سن کر لوگ کیا کہیں گے اور غالباً اسی وجہ سے وہ محلے بھر کی محبوبین چکی تھی۔

نوجوان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے اور سرد ہفتے۔ وہ محسوس کرتے کہ شہزاد میں وہ زندگی کو صحیح شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ دکھلوے اور رسم سے آزاد بے پرواہند و بے نیاز۔

محلے کی لڑکیاں حیرت سے اس کی طرف دیکھتیں اور منہ میں انگلی ڈال کر رہ

جانیں۔ ابتدا میں تو محلے کی بوڑھیاں بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں احساس ہونے لگا کہ جوانی کے قائم کروہ اصولوں پر نہ چلے وہ اچھی کیسے کھلائی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود شہر اور کی مخصوصیت اس کے اخلاق اور اس کی طبعی فیاضی کی وجہ سے انہیں شہر اور سے مل کر ان اصولوں کے باوجود خوش محسوس ہوتی تھی۔ پھر جب وہ چلی جاتی تو ان کو غصہ آنا شروع ہو جاتا۔..... توبہ کرنی بے پرواڑ کی ہے..... وہ محسوس کرتیں جیسے انہیں دھوکا دیا گیا ہوا اور فریب سے خوش کر لیا گیا ہوا۔ پھر ان کی زبانیں حرکت میں آ جاتیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ کسی نہ کسی بھانے شہر اور کی پر پرواٹ اور جو اس پر نکتہ چینی کرتیں۔

”توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ اب تو کوئی چھوکریاں ہو نہیں کی طرح قلائقیں بھرنے لگیں ہیں۔ ابھی یہاں تھی اور یہ واپس اپر چوبارے سے بول رہی ہے جیسے پاؤں تلتے پہیے لگے ہوئے ہوں۔“

”اور بہن اللہ ماری یہ سیرھیاں جو ہیں۔ انہیں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر چڑھنا بھی تو ممکن نہیں۔“

”یوں چڑھ جاتی ہے جیسے پانی کا گلاس پیا۔“

”توبہ ماں یہ تو بھلا سیرھیاں ہیں۔ وہ تو نگاہوں پر چڑھی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ ذرا نہیں جھگجتی۔“

”کوئی زمانہ آیا ہے ماں۔ پر شکر ہے اپنے محلے کو ہو انہیں لگی۔“  
”اللہ بچائے لڑکی۔ یہاں پھر بھی اللہ کا فضل ہے بس یہ باہر سے آنے والیاں ہی جل کو گندرا کرتی ہیں ہاں میں تو سچ کہوں گی۔“

نہ جانے شہر اور کو ان باتوں کا علم تھایا نہیں لیکن اس کے برناوے سے کبھی ظاہر نہ ہوا تھا۔ محلے کی عورتوں کو دیکھ کر وہ یوں کھل جاتی جیسے نو خیز کلی ہو۔ ان کی ہر ضرورت کو فراغدی سے اپر اکرتی لیکن اس کے علاوہ اسے ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف دو

چار گھر انوں سے اس کامیل جوں تھا اور وہ بھی محض سرسری۔ چو بارے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کروہ کوئی کی طرح چیخت۔

”کیوں چھپی۔ آج تو بہت مصروف نظر آتی ہو۔ کیا پچھا امر تر سے آگئے۔“

چھپی منہ میں انگلی ڈال لیتی۔

”ہائے اللہ۔ اس لڑکی نے کیا کہہ دیا۔ کوئی نے گا تو کیا کہے گا۔“ اس کے باوجود اس دبی دبی حقیقت کا اظہار سن کر چھپی کے چہرے پر سرت کی ایک رو دوڑ جاتی۔

محلے والیوں کے لئے شہزادی کی باتیں انوکھی ہوتیں کی وجہ سے بے حد جاذب تھیں اور اسی جاذبیت کی وجہ سے وہ اس پر نکالتے چینی کرتی تھیں۔

جانو کے شہزادے کے گھر میں آنے کو ایلی نے بہت برآ مانا۔ جانو کی موجودگی کی وجہ سے اس کا شہزادے کے پاس بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جانو کیا کہے گی۔ یہاں کیوں بیٹھا رہتا ہے۔ اپنے گھر کیوں نہیں جاتا۔ اور پھر جانو تو منہ پر کہہ دینے سے بھی دربغ نہیں کرتی تھی۔ وہ تو براہ راست شہزادے کے ہدایتے گی۔ اسے نہ لگایا کر منہ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ اللہ رکھے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اب کیا بچھے ہے جو ہر وقت تجھ سے چپا رہتا ہے، لیکن شہزاد کو یہ بات سوچھی تک نہ تھی۔ شہزاد جانو کی بات کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی جب وہ ایسے مسائل چھیر لیتی تو شہزاد پچکے سے کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔ غالباً اس نے کبھی جانو کی بات کو سنا ہی نہ تھا اگرچہ اس وقت وہ بے تو جھی سے ہاں کرتی رہتی۔

ادھر جانو جب سے شہزادے کے پاس آئی تھی اس کی یوں رکھوالي کرنے لگی تھی جیسے شریف کی ایجنت ہوا اور شہزاد کو نظر بد سے بچانے کے لئے متعین کی گئی ہو۔ وہ شہزاد کی آدمی آستیوں کو دیکھ کرنا کہ منہ چڑھاتی۔

”اے ہے۔ یہ کیا نگلی بائیں لئے پھرتی ہو تم خواہ مخواہ اپنا گورا رنگ چکاتے

پھرنا۔ آستینیں تو پوری ہوئی چاہیں جو باعزت عورتوں کو بھتی ہیں۔“  
اس پر شہزادہ مسکرا کر کہتی۔

”ہے نا۔ اچھی لگتی ہیں نا۔ وہ بھی کیا کہ آستینیں جو ہاتھوں پر لٹک رہیں۔ اچھا  
اب چائے بنایا کر۔“

شہزادے کے اس انداز کو پہلے پہل تو جانو سمجھنہ سکی۔ شہزادی باتیں سن کر اسے سمجھ  
میں نہیں آتا تھا کہ جواب میں کیا کہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ شہزادے کے انداز سے  
مانوس ہوتی آئی اور آپ ہی آپ بڑھانے میں وقت بس رکھنے لگی۔

ایلی حیران تھا کہ شہزادی باتوں پر بیخ پا ہیوں نہیں ہوتی۔ اسے غصہ کیوں نہیں  
آتا۔ وہ بات نہ کر کیوں نہیں دیتی ہے۔ عپر تاں پر ٹکرنا تک نہیں آتا بلکہ بسا اوقات  
وہ اس کیا بات سختی ہی نہیں جیسے جانو جھک مار رہی ہو۔

### وکھیا مینا

چائے بنائے کے بعد جانوا پنا کھانا برتن میں ڈال کر گھر چلی آئی اور وہ دونوں اس  
والان میں اکیلے رہ گئے۔ شہزادے کے ساتھ اپنے آپ کو اکیلے پا کر ایلی کا دل دھڑ کئے  
لگا لیکن اس کے باوجود شہزاد خاموشی سے اپنے کام میں یوں لگی رہی جیسے اسے ایلی  
کے وجود کا علم ہی نہ ہو۔

”شہزاد۔“ ہر دو منٹ بعد ایلی زیر لب اسے آواز دیتا۔ ”شہزاد۔“

”ہوں۔“ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیتی۔ ”کہو۔ کیا کہنا ہے۔“ اس کی  
آواز میں عجیب سی بیگانگی ہوتی جیسے وہ شہزاد ہی نہ ہو جس نے اس پر وہ نگاہ ڈالی تھی۔

”دھڑ دیکھوں۔“ وہ منٹ سے کہتا۔

”کیا دیکھوں؟“ وہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ ”کیا ہے دیکھنے کو یہاں؟“  
”اخوہ۔“ ایلی چلاتا۔ ”اتنی بے پرواہی۔“

”کیا ہے؟“ کچھ دیر بعد شہزاد نے سراٹھیا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ

زمین میں گڑا ہوا ایک پتھر ہو۔

” بتاؤ نا کیا کہنا ہے۔“

ایلی نے جھپٹ کر اس کا بایاں بازو و تھام لیا۔

”بس یہی کام تھا۔“ وہ خشن آواز سے بولن اور بائیں میں بازو و کواس کے حوالے کر کے یوں کام میں منہمک ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں کاٹھ کا بازو ہو۔ بے کار۔ بے جان۔

” یہ کیا حماقت ہے۔“ بولہ بولی۔

” کیا حماقت؟“ ایلی نے پوچھا۔

” اور کیا حماقت نہیں تو۔“ شہزاد نے بازو و تھام لیا۔ پیغمبر کر باتیں کرونا۔“

” کیا بات کروں؟“ ایلی نے پوچھا۔

” کوئی بھی ہو۔“ شہزاد بولی۔

” اچھا۔“ ایلی کو سوچھی۔ ” تم اتنی پیاری کیوں ہو شہزاد؟“

” ہوں پتھر۔ کر لو جو میرا کرنا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

” کاش..... میں کچھ کر سکتا۔“ ایلی نے آہ بھری۔

” کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بس!“ وہ ہنسنے لگی۔

” مجھے اکسار ہی ہو۔“ ایلی غصے میں بولا۔

” پیار یوں سے لڑا بھی کرتے ہو تم؟“ شہزاد نے پوچھا۔

” لڑائی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں نہیں لگتی کیا؟“

” کس سے لڑوں کوئی ہو بھی لڑنے کے لئے۔“

” مجھ سے لڑوں۔“

” تم سے کیا لڑنا۔“ شہزاد مسکرائی۔

” اس سے لڑتی ہو کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ۔“ وہ قہقہہ مار کر بھی۔ اس کی بُنی میں تحریر کی دھار تھی۔ ”اے آہی بھرنے سے فرصت بھی ہو۔ وہ کیا لڑے گا۔ اور آج کل تو وہ ابا جان کے پاس گیا ہوا ہے۔“

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اب تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ بولی۔ بکرے کی جان گئی پر کھانے والی کو مزہ نہ آیا۔

”میں نہیں سمجھتا۔“ وہ منت سے بولا۔

وہ مسکرا نہ لگی۔ ”تم کیا سمجھو گئے؟“

”آخر بات کیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔“ ایلی نے محسوس کیا جیسے بات اس کی ذات سے متعلق ہو۔ ”2002-2006“  
”میں کیا بتاؤں۔ انہیں سے پوچھ لیتا کبھی۔“  
”کس سے؟“

”ان سے یا سانوری سے۔“ شہزادے ایک خصوصی انداز سے کہا۔

”سانوری سے؟“

”ہاں ہاں اسی سے۔ اب کیا بھول گئے اسے۔ ان دونوں جب وہ اس کوٹھے پر شہاد کرتی تھی اور تم اوہ رہ چھت پر منہ پر کتاب رکھے پڑھنے کے بھانے پیٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے کیا معلوم نہیں۔“

”شہزادے۔“ ایلی نہ امت سے چلایا۔

”اس بے چاری کو کیا پتہ تھا۔ وہ تو تمہارے تحریر پر ہی مر مٹی۔“ شہزادہ نہ سننے لگی۔  
”تمہاری دھنیں گا گا کر رویا کرتی تھی۔“

”رویا کرتی تھی؟“ ایلی حیران ہو رہا تھا۔

”اپنی طرف سے تو وہ محبت لگا بیٹھی تھی تم سے۔ اسے کیا معلوم تھا کیسے لگائی جاتی ہے محبت نہ جانے کوئی بات پسند آگئی تھی اسے تمہاری۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا

تو وہ سب اسے چھیڑنے لگے۔ اس وجہ سے وہ اور بھی ضد میں آگئی اور اس نے اماں سے صاف کہہ دیا میں ایلی سے شادی کروں گی۔ ”شہزاد ہٹنے لگی۔“ ان دونوں مجھے کیا خبر تھی کہ ایلی۔“ وہ بامعنی انداز سے رک گئی۔ پھر اس نے بامعنی نگاہ اس پر ڈالی۔ ”کیا پتہ تھا۔“ وہ ہٹنے لگی۔

ایلی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ شہزاد ہٹنے لگی۔

”بے چاری نے بڑے بڑے طعنے سے تمہارے لئے چادرے گھروالوں کی نگو بن کر رہ گئی۔ اماں تو اسے آنکھیں وکھاتی تھی۔ تمہارا نام سن کر اماں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ نہ جانتے کیوں جیسے تم سے لوگ بیڑا ہو۔“

”کیوں۔ میں نہ تمہاری اماں کا بکارا تھا۔“ ایلی نے کہا۔

”جب تو نہیں بکارا تھا مگر اب تو۔“ اس نے ایک بار ایلی کو پھر اسی نگاہ سے دیکھا۔ درود شدن دیئے اس کی طرف لپکے۔

”شہزاد۔“ اس کے بازو کا سہارا لینے کے لئے ایلی آگے بڑھا۔

”پھر بات ابا تک پہنچ گئی۔“ شہزاد نے دھنٹا انداز بدلا۔ ”اور انہوں نے فوراً مشورہ کر کے سانوری کار شستہ کر دیا۔ زبردستی۔“

”کس کے ساتھ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہ جانے کون ہیں۔ کہتے ہیں کوئی ایس ڈی او کا لڑکا ہے مگر مجھے تو نہیں دکھتا ایس ڈی او۔ تمہارے شریف صاحب نے بھی ابا کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اب وہ بے چاری اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہاں۔“

”میں تم سے کیا مذاق کروں گی۔“ وہ بولی۔ ”مذاق تو اس بے چاری کا اڑ گیا جو تم سے دل کی بات بھی نہ کہہ سکی۔“ بے چاری نے کئی ایک بار خط بھی لکھا تھا مگر تمہارا پتہ معلوم نہ تھا اور وہ ڈرتی تھی کہ کسی اور کے متھے نہ چڑھ جائے۔ پھر جب اس نے سنا کہ تم اس امر تراویل کی کے لئے پا گل ہو رہے ہو تو دل ٹوٹ گیا۔ میرے پاس رویا

کرتی تھی۔“

”شہزاد۔“ ایلی نے اپنا سر اس کے بازوں پر رکھ دیا۔

”اور آج تم میرے بازو سے لپٹے ہو۔“ وہ قہقہہ مار کر رہی۔ ایلی نے محسوس کیا

جیسے وہ قہقہہ اسے چھری کی طرح چیڑتا جا رہا ہو۔

”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔“ وہ گزگز اکر بولا۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ دفعتاً شہزاد کا اندماز بدل گیا۔

”تمہیں میرا کوئی خیال نہیں کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کسی کا بھی خیال نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”تمہیں شریف کا خیال ہے تاں۔ میں جانتا ہوں۔“ ایلی کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ کپٹیاں تحرک رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اس کا کلیجہ چاٹ رہا ہو۔

”تمہیں شریف سے محبت ہے نا؟“

”یوں نہیں سمجھلو۔“ ایلی چلا کیا۔ ”میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔“

”سیانے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔“ شہزاد بولی۔

”سیانا ہوتا تو تمہارے لئے یوں پاگل نہ ہوتا۔“ ایلی نے کہا۔

”چج ایلی۔ ایک بات پوچھوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”تمہیں مجھ سے محبت جتنا کی کیا سو جھی؟“

”تمہارا مطلب ہے میں فریب کر رہا ہوں۔“ ایلی نے بناؤٹی غصے سے کہا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلا کی۔ ”میرا مطلب ہے۔“ اور پھر رک گئی۔

”میں سمجھتا ہوں تمہارا مطلب۔“ وہ اٹھ بیٹھا اور فرحت کی طرف چل پڑا۔

”ایلی۔“ شہزاد نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا۔

مگر ایلی کے لئے واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا۔

اس رات وہ دیر تک کروٹھیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کے شکوک اور تو اہم بھڑوں کے چھتے کی طرح بخیختا رہے تھے۔ سینہ سلگ رہا تھا۔ کلیچہ کوئی مصل رہا تھا۔ چاروں طرف سے لہریں ہی اٹھ رہی تھیں جو ہر ساعت مزید شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ کیا یہی محبت ہے جس کے لئے وہ اس قدر بتاتا تھا۔ کیا یہی وہ محبت ہے جس کی شریف اسے تلقین کیا کرتا تھا۔

”محبت کرو ایلی محبت نہ“ وہ اس کے روپ و لکڑا مسکرا رہا تھا۔ ”محبت کرو ایلی چاہے کسی سے کرو۔“

لیکن شریف کی اپنی کیفیت تو ایسی نہ تھی۔ وہ تو اس طرح کروٹھیں نہیں بدلتا تھا۔ وہ توڑے اطمینان سے منہ میں چھتے کی نے لیے لیٹا چھت کو سکتا رہتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بہم مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی۔ اور اس کی آنکھیں گویا ہر وقت نشے میں رہتی تھیں۔ نہیں نہیں یہ محبت نہیں۔ نہ جانے کیا ہے محبت۔ نہیں محبت تو ایک خمار ہوتی ہے۔ ایک نشہ، ایک کیفیت!

دراصل اسے شہزاد کے برتاؤ کے متعلق کچھ سمجھے میں نہ آتا تھا۔ کسی وقت تو وہ ایلی سے اس قدر قریب آ جاتی کہ وہ محسوس کرتا جیسے دونوں ایک جان دو قالب ہوں۔ اس وقت اس کے دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ فاتح ہو۔ جیسے اس نے دنیا کی بہترین نعمت، بہترین لذت کا پالیا ہو۔

لیکن جلد ہی مظہر بدلتا اور دوسری ساعت میں شہزاد اس سے کوسوں دور پلی جاتی۔ جیسے اس کے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ جیسے جانتی ہی نہ ہوا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور پر بیگانہ ہوں۔ اس بیگانگیت کو وہ روح کی گہرائیوں میں شدت سے محسوس کرتا اور اس کا جی چاہتا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دے۔ چینیں مار مار کر رو دے اور پھر کوئی اکتارہ پکڑ کر دنیا کے کونے کونے میں بے وفا کی کے گیت گاتا

اسے خیال آتا کہ شہزاد کا محبت کاروپ مخفی ایک دھلاوا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ وہ سوچتا۔ آخر شہزاد کیا پڑی ہے کہ ایک بد صورت بے ڈھنگے چھوکرے سے محبت کرے۔ کوئی محلے کی لڑکی ہوتی تو بھی بات قابل قبول ہوتی۔ لیکن شہزاد..... وہ تو جس کو چاہتی اپنے روپ و جھکا سکتی تھی۔ شاید اس کا مقصد صرف لوگوں کے سر جھکانے کے علاوہ پچھنہ ہو۔ لوگوں کو تنیر کرنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ ہو۔ اس خیال پر ایلی کے تصور میں شہزاد کرش بھلوان کی طرح مرلی الٹا کر ایک انداز سے کھڑی ہو جاتی اور اس کے گروپنگزروں سر بھکے دکھائی دیتے۔ اور پھر ایلی ان ان دیکھے سروں کو پہچانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ یہ خوش نصیب کون ہے۔ وہ کون۔ پھر اس کے دل میں وہم احتتے اور وہ سوچنے لگتا شاید رفیق وہ خوش نصیب ہو۔ جبھی تو شہزاد سے دیکھ کر مسکرا یا کرتی ہے اور گھنٹوں کسی کو نہ میں، سیڑھیوں پر، منڈر یا جنگل پر اس کے سامنے کھڑی رہا کرتی ہے۔ مگر کسی وجہ سے اسے یقین نہ پڑتا کہ رفیق شہزاد کے لئے جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ اس کی جیب کے زیشمیں رومال، پریم شاستر اور سینٹ کی شیشی اور اس کی آنکھوں میں پڑتی ہوئی بخشی پھوار کے باوجود جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ رفیق میں تھا ہی کیا..... نہیں نہیں ..... تو پھر؟ ..... ایک سوالیہ نشان اس کے روپ و آنکھ اہوتا۔ پھر وہ نشان شریف کی شکل اختیار کر لیتا۔ ضرور اسے شریف سے محبت ہے جبھی تو اس پر مینڈک پھینکا گیا تھا۔ جبھی تو اس کی آمد پر شہزاد کی چال تک بدل جاتی ہے اور وہ سیڑھیاں اتر کر چھم سے رک جاتی ہے۔

”میں وہ بیٹھے چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

اس پر ایلی احساس رقابت سے لوٹنے لگتا اور اس کے سینے میں ایک جلن سی ہونے لگتی۔

رات بھروسہ اسی طرح دیوانہ وار کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صحیح کے قریب تھک کر سو گیا۔ پھر جب وہ چائے لی رہا ہوتا تو میر جیوں میں..... چشم کی آواز سنائی دیتی اور شہزاد قص کرتی ہوئی اس کے رو برو آ کھڑی ہوتی اور مسکرا کر کہتی۔

”ہاں کب سے چائے بنی ہوئی ہے اور ایلین تم یہاں بیٹھے ہو۔ آؤنا۔“

یہ کہہ کر وہ مسکرا کر وہی نگاہ اس پر ڈالتی اور وہ اپنے تمام وہم اور عزم بھول کر پاتھ کتے کی طرح اس کے پیچھے چلا پڑتا۔  
اس پر فرحت چلاتی۔  
”لتو تو ایلی کو انگلی سے پکڑ کر لے چلنا۔“ اس کی بات میں دھار ہوتی تھی۔  
مگر شہزاد گویا بھری بنت جاتی تھی جیسے متاثر ہو۔ ”انی خیر منا۔“ وہ چلاتی۔  
”کسی روز تجھے انگلی سے پکڑ کرنے لے جاؤں۔“

”مجھے کون انگلی پکڑ کر لے جاتا ہے جی۔“ فرحت زیریں کہتی۔

”تم تو آنکھیں دکھاتی ہو ورنہ لے ہی چلوں کبھی۔“ شہزاد اپنستی۔

اور بات ہنسی میں ٹل جاتی۔

پھر ہاجرہ مظلوم انداز میں شہزاد کے چوبارے کی چوکھت پر آ کھڑی ہوتی۔

”کب آئے گا تو ایلی؟“

”نہیں ویسے پوچھ رہی تھی۔ جلدی آ جانا ایلی۔ فرحت کھانے پر انتظار کرتی رہتی ہے۔“

”ٹھیک تو ہے۔“ شہزاد نہ کہتی۔ ”یہاں قحط پڑا ہوا ہے۔ کھانے کو تو صرف وہیں ملتا ہے فرحت کے ہاں۔“

اور وہ دونوں دو بچوں کی طرح بیٹھ کر گپیں مارتے اور نہس نہس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

اور جانو نہیں دیکھ کر باور پی خانے کے برتنوں کو گھورتی اور آخر زیریں کہتی۔

”لو بیجوگے بھی چھومنو۔ یوں بھاگے دوڑے پھرتے ہیں جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ میں کہتی ہوں لوگ دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے۔“

”جو ان کے جی چاہے وہ کہیں۔ جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے۔“ شہزادائیلی کی طرف وہی نگاہ ڈالتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس ایک نگاہ کے سہارے وہ ساری دنیا کے خلاف یہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ جانے اس نگاہ میں کیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایلی کو سمجھی پچھوں جاتا تھا۔ اسے رات بھر کی گردیہ وزاری بالکل ہی بھول جاتی۔ اس کے ذہن میں کوئی سوالیہ نہیں پڑ رہتا اور وہ سمجھتا کہ زندگی واقعی قابلِ زیست ہے۔

جانو شہزاد کا جواب دن کو بظاہر حیپ ہو جاتی مگر وہ شکایت دن بھر اس کے انداز میں گویا بوند بوند رکھتی۔ اس کی چال سے، اس کے سر ہلانے کے انداز سے، اس کے ہونٹوں کے خم سے، اس کی ہربات سے متربع ہوتا تھا کہ وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں جانتی مگر وہ دونوں جانو کے اس اظہار سے بے نیاز بیٹھ کر چائے پیتے اور پسیں ہائکتے اور بہانے بہانے ایک دوسرے کو دیکھ کرتے۔ پھر جو نبی جانو کسی کام کے لئے چوبارے سے نیچے اتر جاتی تو دفعتاً ان کی وہ رنگیں باقی میں ختم ہو جاتیں۔ ایلی شہزاد کی طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے بچہ ہو۔ اور اس کے سامنے شہزاد مٹھائی کی ایک تھالی۔ اس کی بدلتی ہوئی نگاہ دیکھ کر شہزاد دفعتاً سنجیدہ ہو جاتی اور پھر کسی کام میں مصروف ہو جاتی اور یوں ایلی کے وجود سے بے نیاز ہو جاتی جیسے اس سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ یہ دیکھ کر ایلی کے دل میں غصے کا ایک طوفان کھولتا اور وہ پاگلوں کی طرح شہزاد کی طرف پڑھتا۔

”خدا کے واسطے۔“ وہ زیر لب سنجیدگی سے کہتی۔ ”جانو آ جائے گی۔“

”نہیں نہیں۔“ ایلی چلاتا۔ ”وہ تو ابھی گئی ہے۔“

”کوئی اور آ جائے گا۔ ہوش کرو۔“ شہزاد اسے گھورتی۔

”اور تم تو کہتی تھیں۔ ایلی کیا لوگوں سے ڈرتے ہو۔ یا وہ؟“ ایلی کہتا۔

”تم سمجھتے تو ہو نہیں۔“ شہزادی آواز میں درشتی پیدا ہو جاتی۔

اس پر ایلی کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ گھرے فکر میں پڑ جاتا اور ایک سوالیہ نشان اس کے سامنے ابھر نے لگتا۔

اس طرح تخلیے میں وہ دونوں بیگانہ اور ایک دوسرے کے روپ و بیٹھے رہتے۔  
شہزادہ جانے کون سے افق میں کھوئی رہتی اور ایلی اس کی طرف پا گلوں کی طرح چلناکی باندھ کر دیکھتا رہتا یا اس کا بازو و تھام لیتا اور وہ اسے یوں اس کے حوالے کر دیتی جیسے بچے کو بہلانے کے لئے ایک سکھونا ہوا اور خود بے نیاز ہو جاتی جیسے وہ بازو اس کا اپنانہ ہو۔ کچھ دیر پہنچ تو وہ اس بے جان بازو سے دیکھتا رہتا۔ پھر اس احساس ہونے لگتا کہ اس بازو سے شہزادہ کا دور کا واسطہ نہیں۔ پھر اسے ایک غم طراب گھیر لیتا اور وہ شہزاد کے قریب بیٹھ کر محروم محسوس کرتا اور محرومیت کی وجہ سے یا قرب کی بنا پر کروٹیں بدلتا اور کڑھ کڑھ کر اپنی جان ہلکان کر لیتا حتیٰ کہ کوئی آجاتا اور شہزاد پاؤں کی چاپ سنتے ہی اس سے اپنا بازو و چھڑا کر دور ہو پڑھتی اور پھر نہس نہس کر باتیں کرتی۔ اس کی طرف خاص انداز سے دیکھتی۔ وہی انداز۔ اس طرح وہ تنہائی میں قرب کے باوجود ایک دوسرے سے دور رہتے اور محفل میں دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے۔

ایلی کی صرف ایک خواہش تھی کہ وہ شہزاد کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب۔ اور شہزاد اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہی مسکراہٹ۔ باہمی سازش کی مسکراہٹ۔ اور تنہائی میں بھی وہ اس کے اس قدر قریب ہو جاتی کہ دونوں میں ذرا فرق نہ رہے۔ اس کے علاوہ اسے شعوری طور پر کوئی آرزو نہ تھی۔

ایلی کو کسی مخصوص جسمانی قرب کا خیال نہ تھا بلکہ اسے اس قرب سے ڈر لگتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اس قابل نہیں کہ شہزاد کے ساتھ وہ قرب حاصل کر سکے۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس قربت کی نوبت آگئی تو وہ بری

طرح سے ناکام رہے گا۔ اور پھر شہزاد کیا کہے گی۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اسے ایسے قرب سے نفرت تھی۔ اس کے خیال میں ایسا قرب محبت کے جذبے کے لئے باعث نگ تھا۔ محبت کی تو ہیں تھا۔ پھر شہزاد کی پاکیزہ دیوی سے۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس خیال پر نہیں اسے وحشت ہوتی تھی۔

صح چائے پی کر روزہ دیر تک شہزاد کے پاس بیٹھا رہتا تھا کہ مظلوم صورت بنائے ہوئے ہاجرہ نمودار ہوتی۔

”اے ہے فرحت کب ہے انتظار لر رہی ہے کہ کھانا کھاں گو۔“

”میں ابھی آیا۔“ کہہ کر روزہ ماں کوٹاں دیتا۔

اس پر جانو بربڑا نکلتی۔

”تو بے کیا زمانہ آیا ہے اولاد کے دل میں ماں کا لحاظ نہیں رہا۔“

آدھا ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ پھر آ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ مجبور ہو کر اٹھ ڈیختا اور بادل نخواستہ ماں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

جب ایلی کھانا کھا رہا ہوتا تو سیر ہیوں میں وہی دھماچوکڑی کی آواز سنائی دیتی اور پھر چھم سے شہزاد پا تھو میں سالن کی پلیٹ لئے مسکراتی ہوئی آموجود ہوتی۔

”وہ کریلے پکائے ہیں آج کہ چکھ لتو طبیعت سنور جائے۔“ وہ چلاتی۔

”کیوں نہ ہو جی ان ہاتھوں میں جاؤ ہے۔“ فرحت طعنہ دیتی۔

”لوگوں کی تو ویسے ہی طبیعت سنور جاتی ہے۔“ ہاجرہ فرحت کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

”کیوں نہ سنورے جی۔“ شہزاد یوں قہقہہ مار کر ہنستی جیسے اسے طنز کا احساس ہی نہ ہو پھر شہزاد سیدھی ایلی کے پاس پہنچتی اور پھر چوری چوری وہی مسکراہٹ چھلکا کر زیر لب کہتی۔ ”بھاگ کیوں آیا ہے تو۔۔۔۔۔“ پھر با آواز بلند چلاتی۔ ”لے کھا کر دیکھ اپنی انگلیاں نہ چاٹ لیں تو۔“

اس وقت چپکے سے شہزاد کا جناتی ہاتھ ایلی کے پہلو سے نکل کر اس کا گال سہلاتا اور ایلی کی آنکھوں تلنے تارے ناچنے لگتے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی۔ ”دیکھ لے فرحت ایک ہی لقے میں آنکھیں ابل آئی ہیں ایلی کی۔“

فرحت زیریں کہتی۔ ”نجانے کی ساقمہ دیا ہے تم نے۔“  
”یہی تو ایک راز ہے۔“ شہزاد انظر بچا کر ایلی کے منہ پر بلکا سما تھپڑ مار کر کہتی۔ ”یہ کیسے بتاؤں۔ اچھا میں چلی۔“ اور وہ بھاگ کر سیڑھیوں میں غائب ہو جاتی۔  
ایلی بے قوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دیکھا رہتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا لنگراڑ کر اس کے منہ پر لگتا اور ایلی کی با چھین کھل جاتیں اور وہ محسوں کرتا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ تائے سوالیہ کی بجائے استفہامیہ نشانات رقص کرتے۔

شہزاد کا وہ انتقام اس کے گل میں جذب ہو کر خون میں جاتا اور اس کی رگوں میں یوں لہریں لینے لگتا جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے پھر پھینک دیا۔ ایلی کے لئے ہاتھ کا لقمہ نکالنا مشکل ہو جاتا اور جلد ہی وہ کوئی بہانہ بنانا کہ شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑتا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگتا تو فرحت کوئی طنز بھری بات کہہ دیتی یا ہاجرہ مظلومیت بھرے انداز میں اسے نوکتی جس پر وہ غصے سے بھوت بن جاتا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔

جونہی ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچتا تو اس کی اتو قع کے خلاف وہاں کوئی اور ہی شہزاد بیٹھی ہوتی جیسے اس شہزاد سے دور کا کوئی واسطہ نہ ہو جو چشم سے زینے سے اتری تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ حنا مالیدہ ہونے کے باوجود بے جان ہوتے۔ اس کی آنکھیں دور نہ جانے کن مناظر میں کھوئی ہوتیں۔ وہ پھر کے بھگوان کی طرح بیٹھی رہتی جیسے اسے ایلی کی آمد کا احساس تک نہ ہو پھر ایلی اس پھر کے بھگوان کے روپ و بیٹھ کرنے جانے کہاں کھو جاتا یا اس بے جان کھلونے سے کھیلتا جو شہزاد کے

ان دنوں ایلی سارا سارا دن گھر میں چھپا رہتا اور گھر میں بھی وہ کھڑکی میں کھڑے ہونے سے اختراز کرتا کہ کوئی دیکھتا نہیں۔ نہ جانے کیوں دفعتاً اس کی زندگی میں پر وہ داری کا غصہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی کوخبر نہ ہو کہ وہ علی اپور آیا ہوا ہے۔ کوئی اس کا راز نہ پالے لیکن علی اپور میں کسی بات کا چھپے رہنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

علی اپور تو ایک جگہ تھی جہاں سیاہ ناک شاہی بیٹیں آنکھیں موند کر سب کچھ دیکھتی رہتیں۔ اور پھر بات کے پروے میں بڑھا چڑھا کر ایک دوسرا سے کہہ دیتیں۔ ایشوں کی بات دروازے چاؤں چاؤں کر کے دہراتے جنہیں سن کر آوارہ کتے تھے لگاتے اور چپگا دڑیں خوشی سے رقص کرتیں اور انہیں ہیرے کو نے باہر نکل نکل کر چپگا دڑوں کی کھاکلی دیکھتے۔ مسکرا کر پھر سے چھپ جاتے۔ پھر جب سورج کی پہلی کرن محلے کے مکانات کو روشن کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوتی تو محلے والے وہی بات چھیڑ دیتے۔ دلبی دلبی زبان سے بات پھسل لگلتی۔ انگلیاں ڈرامائی انداز سے ابھر کر ہونٹوں پر ٹک جاتیں۔

”ہائے اللہ۔ یہ بات ہے؟“

”تو بے کیا زمانہ آیا ہے۔“

”لووہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی ماں۔ کہتے ہیں ہونہار بروائے چکنے چکنے پات۔“

”پر سن لو تم بہن یہ کاٹھ کی ہندیا چار دن چڑھے گی بس۔“

”پر میں کہتی ہوں اسے شرم نہ آئی۔“

اگر ایلی اس راز کو اتنی اہمیت نہ دیتا تو شاید بات نہ بگڑتی۔ اور اگر بگڑتی بھی تو اس میں تعفن پیدا نہ ہوتا۔ اگر ایلی اس سلسلے میں محض ایک تفریح جانتا اور دیوی کی

بجائے شہزاد کو محض ایک رنگین قتلی سمجھتا یا خوب صورت کھلونا سمجھ کر اس سے کھلیتا تو بات یوں گل حکمت ہو کر خطرناک ہیوں لے پیدا نہ کرتی لیکن ایلی کو پیدائشی طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ایسے تفریحی تعلقات گناہ کے مترادف ہوتے ہیں۔ علی احمد کے کمرے کے خلاف اس نے جو غرض پال رکھا تھا اس کے خیال کو اور بھی مشتمل کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے تعلقات یا ایسی خواہشات کو جائز بنانے کے لئے انہیں حقیقی شکل دینا ضروری ہوتا ہے اور حقیقی عشق میں لازم ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو تباہ کر دے۔ زندگی کو ایک روگ بنالے۔ وصال کے تمام راستے اپنے ہاتھوں سے مدد و کردارے اور پھر عمر بکریاں و حرمان کا ہلاکتے ایک آپا ہج بنار ہے، اسی وجہ سے ایلی نے اس تفریحی تعلق کو جو اس اداں شام کو اس معمولی لی بغزش کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ ماحول سے اخذ کئے ہوئے اختباروں کی وجہ سے ایک لامتناہی اور تباہ کن بمحضن میں بدل دیا۔ اور شہزاد کو دیوی بنا کر خود اس کے روپ و تصوری بن کر پیش گیا۔ اگر وہ شہزاد کی دیوی کی بجائے ایک جنتی جاگتی حسین عورت سمجھتا۔ مرد کی حیثیت سے اس کی آرزو کرتا تو شاید شہزاد میں بھی دوڑھی پیدا نہ ہوتی اور اس کا قرب قرب ہوتا اور بعد، بعد مگر اب ان الجھے حالات میں شہزاد بھی الجھ کرہ گئی تھی جس کی وجہ سے ایلی ان سوالیہ نشانات سے واقف ہو گیا اور اس کی زندگی بے پناہ مسرت اور بے پایاں الٰم کے چکر میں پس کر رہ گئی۔

### وہ راز

ایلی نے اس راز کو اس قدر متبرک بنا دیا کہ محلے کی ناک شاہی ایٹیٹیں جلتے نگ کی طرح بجھن لگیں دروازے آہ وزاری کرنے لگے کتنے کسی آنے والی مصیبت کے مبہم احساس سے مضطرب ہو کر چینیں مارنے لگتے اور محلے والیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

محلے والیاں ایلی کو دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔

”ہے ایلی تو کیا یہاں ہے۔ لو..... اور میں سمجھ رہی تھی کہ لڑکا سکول میں پڑھنے گیا ہوا ہے۔“

”لوہ میں کیا معلوم کبھی دیکھا بھی ہو باہر چوگان میں۔ پہلے تو اللہ مارے ارجمند کے ساتھ پہروں لاٹھیں تلتھیں اور ہتھا اور ارب گویا کسی نہ خانے میں چھپا رہتا ہے۔ کیا ہو گیا تیری عقل کو۔“

کوئی کہتی۔  
”اے ہے ہر کے تو قاب شکل و کھانے سے بھی رہا۔ ایسا بھی کیا۔ نہ لڑکے اپنوں سے ملتے ملاتے رہتا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

کوئی مسکرا کر کہتی۔  
”اپنوں سے تو ملتا رہتا ہے لال۔ اپنے وہی ہوتے ہیں تاں جسے کوئی سمجھے۔ ہم بوڑھیوں کو اپنا کیسے سمجھے۔ ماشاء اللہ اب جوان ہے۔ اب تو اس کی ماں کو چاہئے کہ شادی کر دے اس کی۔“

”نہ جانے باپ کی طرح کتنی عورتیں گھر لائے گا۔“

”نہ بہن دعا کرو۔ اللہ ہدایت دے۔“

محلے والیاں تو پھر بھی بات اشارتاً کرتی تھیں لیکن محلے کے لڑکے تو کھلے بندوں اس سے سوالات کرتے تھے۔

”کیوں بھی۔ کیا پھر سے ماں کی گود میں پڑ گئے۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کونے چکر میں سچنے ہو۔ اب تو اونچی ہواں میں اڑنے لگے ہوں۔“

وہ خود بھی انہیں ملنے سے کتراتا تھا۔ باہر تو وہ لکھتا ہی نہ تھا اس لئے اس کے پکڑے جانے کا احتمال ہی نہ تھا اور گھر پر آواز دینے سے وہ اچکچا تے تھے۔ اگر کوئی آ کر آواز دیتا بھی تو ایلی خاموش ہو رہتا کہ وہ سمجھے گھر پر نہیں اور واپس چلے جائیں۔ ان دونوں رفیق اور جمیل تو علی پور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ارجمند کو لا ہو رکے

قریب تارپین کے تیل کے کارخانے میں مازمت مل گئی تھی۔ یوسف بھی وہاں نہیں تھا۔ لے دے کے رضا تھا۔ وہ لکڑی شیکتا ہوا آپنچتا اور معصوم سامنہ بنا کر پیچی نگاہوں سے شہزادی کھڑکیوں تلے کھڑا ہو کر آواز دیتا۔

”ایلیا!“

ایلی آوازن کر خاموش ہو رہتا۔

جانو آگ بکولہ ہو جاتی۔

”سدھ بدھیں رہی کیا سنائیں دیتا کوئی آواز دے رہا ہے۔“

ایلی مسکرا کر خاموش ہو رہتا اور شہزادیوں کاہنے کام میں منہک دکھائی دیتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جانو دو ایک منت کے لئے کبھی ایلی اور کبھی شہزادی کی طرف دیکھتی اور پھر بڑھاتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔

”کون ہے؟“ جانو چلاتی۔

”ایلی ہے کیا؟“ رضا اوپر دیکھے بغیر چلاتا۔

”بیٹھا ہے۔“ جانو غصے میں چھپتی۔

”اچھا۔“ رضا جانو جو جھکر بھرا ہن جاتا۔ ”جب وہ آئے تو دکان پر بھیج دینا۔“

جانو پھر سے یوں چلاتی جیسے رضا کی بجائے اڑوں پڑوں والوں کو سنارہی ہو۔

”میں کہتی ہوں میں بیٹھا ہے یوں تھیں۔“

”اچھا۔“ رضا چلتے ہوئے کہتا۔ ”جب وہ آئے تو دکان پر بھیج دینا۔“

جانو کامنہ غصے سے ٹپنے لگتا۔ ”عجب احمق ہے میں کچھ کہہ رہی ہوں اور وہ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو جانو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا؟“ ایلی اسے ستانے کے لئے معصوم انداز میں پوچھتا۔

”لواب اسے بھی آگیا ہوں۔ کب سے چلا رہی تھی کہ رضا یونچے بلا رہا ہے۔“

ستے ہی نہیں۔ اور اب یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔“

”ہائیں۔ مجھے بلا رہا تھا۔“ ایلی بن کر کہتا۔

”لو.....“ جانو چلانے لگتی اور خرافات بکنا شروع کر دیت۔

پھر جب وہ تھک کر خاموش ہو جاتی تو شہزاد چکے سے کہتی۔

”کیا بات ہے جانو۔ آج تو خاموش کیوں ہے۔ بات ہی نہیں کرتی کوئی؟“

اس پر جانو کے تن بدن میں آگ لک جاتی اور وہ ہاتھ پلاہلا کر چلاتی۔ شہزاد آنکھ بچا کر ایلی کی طرف لے کر بامعنی انداز سے مسکراتی۔ اس پر ایلی کے جسم میں خوشی کی رو دوز جاتی اور وہ محسوں کرتا جیسے وہ دنوں بچے ہوں اور مل کر جانو کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔

”مجھے کیوں ستار ہے ہو۔ اپنا سر لھاؤ۔ چاہے جو جی میں آئے کرو۔ مجھے کیا واسطہ میں تو تمہارے ہی بھٹکے کی کہتی ہوں کہ یوں سارا دن ایک جگہ بیٹھ رہنا اچھا نہیں۔ لوگ ایسے ہرے ہیں کہ بات کے بغیر نہیں رہتے۔ چاہے کوئی کتنا ہی پاک پرہیز گار کیوں نہ ہو۔ لیکن تم نہیں سنتے۔ میری تو نہ کہی۔ مجھے کیا غرض۔“ جانو بکے جاتی۔

جب وہ ایک لمبا چوڑا لکھ پلا کر فارغ ہوتی تو شہزاد چکے سے بات ٹالنے کے لئے کہتی۔

”جانو! آج چائے نہیں پلاو گی کیا؟ تم بالکل ہی بھوکا مارو گی ہمیں..... کیوں ایلی! چائے پیو گے نا؟“  
ایلی نہ س کر کہتا۔

”لو چائے بھی نہ ملی تو میں پیا سامراجوں گا۔“ اور شہزاد چھپ چھپ کر مسکراتی۔ اور اس کی مسکراہٹ کا راز ایلی کی روح میں ناچتا اور وہ چھپا کر رکھنے کی اور بھی شدت سے کوشش کرتا۔

لیکن آصفی محلے کی سیاہ اینٹیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ بھینپتے کی کوشش کرتیں اور آصفی مکانات کے دروازے زیر لب چوں چوں کر کے مسکراتے، ہستے اور پھر رات کے اندر ہیرنے میں محلے کے کتنے روتنے، چمگادڑیں چینتیں اور ان تہہ خانہ نما مکانات میں محلے والیاں سر جوڑ کر باتیں کرتیں اور پھر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتیں۔

ایلی کے شب و روز میں اس کے علاوہ صرف ایک بات تھی۔ ہر روز یا ہر دوسرے روز آصف کا ایک نیک خاطر آ جاتا جس میں تباہی اور بر بادی اور ایلی کے امر ترہ آنے کے متعلق شکوٹ اور شکایت ہوتیں۔ تباہی اور بر بادی کے ان قصوں میں کوئی خاص بات نہ ہوتی اور ایلی اپنے طور پر اندازہ نہ لگاتا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آصف تقریباً بر بادی کا رونار و رہا ہے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آصف کی تمام تر زندگی جھجک کے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور اس کی محبت ”لوگ کیا کہیں گے“ کے سوا کچھ نہیں اس لئے ایلی کو یقین تھا کہ آصف آگے قدم رکھنے کی جرأت نہ کرے گا اس لئے اس کا کسی خطرے میں گرفتار ہونا ممکن ہی نہیں لہذا بر بادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بر بادی ہو سکتی تھی کہ محلے میں اس کی بدنامی ہو جائے یا وہ چنچل لڑکی اسے خوش کرنے کے لئے عام مجمع میں قمیص اٹھا کر چلانے لگے۔

”اب شرم اکر بھاگ کیوں رہے ہو؟“

ویسے بھی تو وہ اس کی بیٹھک کے روشندانوں پر لگے ہوئے ٹاٹ کے گلڑوں پر خشت باری کیا کرتی تھی اور اعلانیہ چلاتی۔

”انہیں اتنا دوان پر دوں کو ہٹا دو۔ ان رکاوٹوں کو دور کر دو اور خود ہیرے سامنے آرام کر سی پر بیٹھ جاؤ رہے میں ماروں گی ایسٹ۔“

ایلی کا خیال تھا کہ آصف محبت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ایلی کے نزدیک تو محبت وہ تھی جس میں انسان محبوبہ کے سوا اور کسی کی پرواہ کرے۔ اس لئے ایلی آصف کی طرف سے مطمین تھا اور اسے یقین تھا کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ شہر چھوڑ کر وہ بھاگ جائے گا اور اپنے باپ کے پاس جا پناہ لے گا جو کسی دو روز از مقام پر ایک سارہ اسپکٹر تھے۔

پہلے چار خطوں کا تو ایلی نے جواب بھی دیا تھا۔ اسے بار بار تاکید کی تھی کہ حالات تفصیل سے لکھے ایلی کو آصف کے معاملے میں بہت وچھپی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار اپنی آنکھوں سے اس نذرِ راغمات قو دیکھے جو لڑکی ہونے کے باوجود اس قدر بے باک اور دلیر ہی کہ اپنے بھائیوں، باپ اور دیگر وارثوں کے سامنے بھی اظہار محبت سے نہ گھبرائی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اسے بھی کوئی ایسا ساتھی مل جائے اور وہ دونوں ہاتھ پکڑے افق کی طرف چل پڑیں اور ایک دمرے کے لئے تمام دنیا کو ٹھکراؤ۔

پہلے تو اس کے دل میں شہزاد کے کہنے پر ”ایلی تم لوگوں کی پرواکرتے ہو؟“ بڑی بڑی امیدیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن پھر جلدی ہی وہ سب گارے کی دیواروں کی طرح دھڑام سے نیچے آگریں۔ اب بھی جب شہزاد اس پر وہ نگاہ ڈالتی یا جب وہ فرحت کی طرف آ کر فرحت یا ہاجرد کے کسی طعنے کے جواب میں ظاہر کرتی جیسے لوگوں سے قطعی طور پر بے نیاز ہو۔ جب وہ لوگوں کی موجودگی کے باوجود آنکھ بچا کر ایلی کا گال سہلا جاتی یا چلتے چلتے چکپے سے اسے چکلی بھر لیتی یا با توں ہی با توں میں آنکھ بچا کر اسے گھوڑتی یا زبان نکال کر اس کا منہ چڑھاتی اس وقت ایلی کا سینہ چوڑا ہو جاتا اور شانے ابھر آتے۔ وہ محسوس کرتا کہ وہ خوش قسم شخص ہے جسے شہزادی ساتھی میسر ہے مگر جو نہیں وہ تنہائی میں شہزاد سے ملتا تو اس کی تمام امیدیں اور مسرتیں خاک میں مل جاتیں۔

ایلی نے آصف کے دو ایک خطوں کے جواب بھیجے تھے بار بار مطالبہ کیا تھا کہ تفصیلات لکھ کر بھیجے۔ لیکن آصف میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ کاغذ پر دل کا راز لکھ بھیجتا۔ اس نے تو اپنی شخصیت کو یوں چھپا کر کھاتھا کہ خود اسے جانے سے محروم ہو چکا تھا۔ تفصیلات کی بجائے وہ تباہی اور بر بادی کے راگ الائپارہا اور بار بار ایلی کو امر تسلیم بلاتا رہا۔ ”خدا گے لئے ایک بار آ کر مجھے بر بادی سے بچاؤ۔“ ..... مگر ایلی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ آصف سے ملنے جاتا۔ وہ تو شہزادی میں اپنا آپ کھو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ شہزادی اوس کے سامنے بیٹھی مشین چلاتی رہے اور وہ اس کی ڈولتی آنکھوں اور لٹکتے ہوئے بھرنے اور گورے بازو وہاں کو دیکھتا رہے۔ اس کے حنایدہ ہاتھوں کا منتظر رہے۔ شہزادی چھپم سے زینے سے اڑتا ہے اور کہے۔

”ایک۔“

”ایک رقمہ کھاؤ تو زندگی منور جائے۔“

اس بات کا متنہی تھا کہ شہزادی زبان نکال کر ایلی کا منہ چڑائے اور پھر سنجیدگی سے جانو سے کہے۔

”جانو۔ تم آج بات ہی نہیں کرتیں۔ ناراض ہو کیا؟“

اگر ایلی کو احساس ہو جاتا کہ آصف شہر چھوڑ کر جانے کے علاوہ کچھ اور کرنے کی بھی امہیت رکھتا ہے تو حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے لیکن ایلی کو تو یقین تھا کہ آصف خطرے میں کوئی نہیں سکتا چونکہ اس میں آگے قدم رکھنے کی جرأت نہیں۔ ایلی کو کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ قدم پیچھے ہٹا سکتا ہے جو خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اسے اس بات کا ذرا بھی احساس ہوتا تو شاید وہ آصف کو ملنے کے لئے امر تسلیم چلا جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

بر بادی اور تباہی کے اعلان کم ہوتے گئے۔ شاعری کا نصر نہ رہا جس سے اس کے پہلے خطابریز ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے خطوط میں صبراً و رضبٹ کی جھلک واضح

ہو گئی اور نفس مضمون میں اختصار پیدا ہوتا گیا اور آخرش ایلی کو آصف کا وہ خط موصول ہوا جس میں صرف ایک جملہ لکھا تھا:

”میں تادم تحریر زندہ ہوں“

ایلی نے وہ خط دیکھا اسے بار بار پڑھا لیکن اسے پچھے بچھانے آیا۔ آخر تادم تحریر زندہ ہوں سے اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات تو ایک حقیقت تھی۔ ایک ایسی حقیقت جسے کوئی جھپٹا نہیں سکتا تھا۔ انسان اپنے مستقبل کے متعلق کیسے جانتا ہے۔ وہ صرف حال کے متعلق ہی جانتا ہے اور طالب کیا ہے۔ ایک ساعت، ایک چوتھری تین ساعت، ایلی نے لا شعوری طور پر ان بالتوں کا جائزہ لیا۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ایک دوسری شام شہزاد کی موجودگی کے باوجود اداس، اس کی سیاہ آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت کے باوجود اداس۔ وہ چپ چاپ شہزاد کے پاس جا بیٹھا۔

”شہزاد، وہ بولا“ یہ دیکھتے؟“

”کیا ہے؟“ وہ بولی ”کیا وہ آنکھوں تو؟“

”یہ خط میرے دوست کا ہے“ ایلی نے اسے خط دیتے ہوئے کہا

”عجیب خط ہے“ وہ بولی ”اس سے تو بہتر تھا اپنی تصویر ہی بھیج دیتا“ وہ ہنسنے لگی

”تم نہیں جانتیں“ ایلی نے کہا ”اسے ایک لڑکی سے محبت ہے“

”اچھا“ وہ مسکراتی ”محبت ہے پھر؟“

”کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے“ ایلی نے کہا ”کہیں وہ مرنا جائے“

”محبت میں مر جائے“ اس نے پوچھا ”کیا لڑکی کو اس کی پرانیں؟“

”وہ جان دیتی ہے اس پر“ ایلی نے جواب دیا

”تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ جان دے، شہزاد مسکراتے ہوئے بولی

”شاید“ ایلی سوچ رہا تھا

”واہ، وہ بھی“ محبت کرنے والے بھی نہیں مرتے۔ وہ تو امر ہو جاتے ہیں، ”اچھا امر ہو جاتے ہیں کیا۔ تو مجھے بھی امر کر دو شہزادے“

”امر ہوتے ہیں، وہ بولی“ کے نہیں جاتے“

”تو کیا میں امر ہو گیا ہوں؟“ ایلی نے پوچھا  
وہ سوچ میں پڑ گئی پھر دفعتاً سراٹھا کر بولی  
”ایلی؟“

”جی،“ ایلی نے امید افزائنا گاہ سے اس کی طرف دیکھا  
”ایلی کیا تم واقعی پھر دفعتاً وہ رک گئی  
”بولوں،“ ایلی نے شہزادہ کا بارہ قبضہ جھوڑا، ایسا ہے رہی تھیں تم؟“  
کچھ نہیں ”شہزادی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔“

”نہیں نہیں“ وہ ضد کرنے لگا ”ضرور بتاؤ مجھے“

”کچھ ہو تو بتاؤں میں، وہ مسکرائی اس کی مسکراہٹ نہ ناک تھی۔

”اچھا تو کچھ بھی نہیں کیا،“ ایلی نے بات کا رخ بدلا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر دفعتاً  
اس نے سراٹھا یا۔

”شہزاد، وہ بولا“ تمہارا کچھ بھی نہیں میرے لئے دنیا بھر کے سبھی کچھ سے زیادہ  
ہے“

شہزاد نے رتپ کر ایلی کی طرف دیکھا اور پھر ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسی باتیں نہ کیا کرو ایلی، وہ بولی

”کیسی باتیں؟“ ایلی نے پوچھا شہزاد خاموش رہی

”کیوں نہ کیا کروں؟“ ایلی نے پھر پوچھا

”بس نہ کیا کرو ایلی میری خاطر،“ شہزاد نے منت سے کہا

”تمہاری خاطر میں سبھی کچھ کر سکتا ہوں شہزاد مگر یہ مطالبہ نہ کرو کہ تمہاری خاطر میں

کچھ نہ کہوں۔“

”اچھا“ وہ ہنسنے لگی ”میری خاطر تم کیا کیا کر رہے ہو؟“

”جو میں اپنی خاطرنیمیں کر سکتا تھا ری خاطر کر سکتا ہوں صرف تمہاری خاطر،“

”چپ“ وہ چلائی اور اس کی ہٹنائی انگلی ایلی کے ہوتوں پر نکل گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب تخلیے میں شہزادے ایلی سے اظہار اتفاقات کیا تھا۔ اس اظہار اتفاقات کے بعد آصف کا وہ خط بے معنی ہو کر رہ گیا۔ ایلی کے لئے تمام کائنات شہزاد سے بھر گئی۔ ان جانے میں ایلی کا سر جھکا اور بازوں کی بجائے شہزاد کے بلوری پاؤں پر نکل گیا اور شہزادہ جانے کیں افق پر کھو کر رہ گئی۔

پلاوا

اگلے روز ایلی جب چوبارے میں بیٹھا ہوا حسب معمولی شہزاد کے پاؤں کا جائزہ لے رہا تھا تو دفعتاً چوگان سے شور سنائی دیا

”کون یہ تو؟“

”دیر کے ملے گا تو؟“ کوئی محلہ والی بولی

”کون آیا ہے بہن؟“ دوسرا بھائی چلائی

”میں کہتی ہوں کوئی آیا ہے کیا؟“

”ہاں ہاں کوئی امر تسری سے آیا ہے؟“

”کس کے ہاں آیا ہے؟“

”اپنے علی احمد کے ہاں“

”اچھا۔ اسم اللہ سو بار آئے کوئی مہمان ہو گا لیکن علی احمد تو آج کل نوکری پر ہیں“

”کہتا ہے ایلی سے ملتا ہے؟“

”ایلی سے ملتا ہے؟“

ایلی گھبرا گیا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور کھڑکی کی درز سے دیکھنے لگا۔ چوگان کے عین

درمیان میں ایک اوپرالہ جوان کھڑا دیکھ کروہ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کون ہے؟ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کے باوجود وہ اسے پہچان نہ سکا

”بیٹے! کیا نام ہے تیرا؟“ مالی حاجاں پنکھا چلاتے ہوئے چلا کر بولی

”کیا کہا شفیع اللہ تیرا بھلا کرنے اجانتا ہے ایلی نہیں ہوگا“

”اے ہاجرہ اے اڑکی فرحت میں کہتی ہوں اڑکی کیا نام ہے تیرا؟“ ہے مجھتو اللہ مارا نام ہی بھول جاتا ہے ہاں اپنی جانوں اے جانوں ذرا ہاجرہ کو آواز تو دینا کہنا کوئی ایلی سے ملنے آپا ہے۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے کملاؤے کہ ایلی کھر پر نہیں اور اس اجنبی سے ملاقات کی کوفت سے جان بچائے لیکن اس وقت تک محلے میں چاروں طرف شور پیچ کا تھا۔ محلے والیاں اجنبی کے متعلق سن گردھوں کی طرح کھڑکیوں اور منڈریوں پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں کی پنکھیاں چل رہی تھیں ہاتھ چل رہے تھے۔ زبانیں قیچی کی طرح چل رہی تھیں۔ اب ان کی زد سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بادل نخواستہ نیچے اتر گیا اور ڈرتے ڈرتے چوگان میں پہنچا۔

”کون ہے؟“ اس نے پوچھا

چاروں طرف سے محلے والیوں نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا

”ہائیں تم شفیع،“ شفیع کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ شفیع اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے پوری طرف واقف تھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ اس نے شفیع کا پہچانا کیوں نہ تھا اور فرض کیجئے دوری کی وجہ سے پہچان نہ سکا تھا تو بھی اس کے نام لئے جانے پر وہ اسے کیوں نہ پہچان سکا؟

”آؤ آؤ“ وہ گرم جوشی سے بولا ”اوپر چلو“

”نہیں،“ شفیع بولا ”مجھے جلدی ہے“

”جلدی ہے تو کیا بیٹھو گے نہیں،“ ایلی نے پوچھا ”کیسے آئے ہو؟“

”تمہیں لینے آیا ہوں،“ شفیع نے جواب دیا  
”مجھے لینے آئے ہو؟“

”ہاں“ وہ رک کر بولا ”میری ساتھ امر تسری چنانا ہے تمہیں،“

”کیوں؟“ ایلی کے منہ میں آؤں نکل گیا جیسے اسے شفیع کی بات بری لگی ہو  
ایک ساعت کے لئے شفیع گھبرا رہا پھر مسکرا کر بولا ”اصف نے بلا یا ہے تمہیں،“  
اس کی مسکراہٹ حضرت آلووہ تھی۔

”اصف نے بلا یا ہے“ ایلی نے دہر لیا  
”ہاں وہ کہتا تھا اسے ساتھ لے کر آنا“

”تم کسی اپنے کام سے آئے ہو گے یہاں؟“ ایلی نے پوچھا  
”نہیں تو صرف تمہارے لئے“

”صرف مجھے لے جانے کے لئے خیریت تو ہے؟“ ایلی گھبرا گیا  
”اصف کی حالت اچھی نہیں،“ شفیع نے آنکھیں جھکا کر کہا  
”حالت اچھی نہیں کیا مطلب؟“

”اس نے کہا تھا میری طرف سے کہہ دینا حالات اچھے نہیں اور ساتھ لے کر آنا“  
شفیع نے بعد مشکل جملہ ختم کیا۔

”ہوں تو حالات اچھے نہیں یہ کہونا اس کے حالات تو کبھی اچھے نہ ہوں گے“ ایلی  
چمک کر بولا۔

”چلواب راستے میں با تینیں کریں گے،“ شفیع بولا

”اگر میں دوسری گاڑی میں آ جاؤں تو؟“ ایلی نے پوچھا

”نہیں،“ شفیع بولا ”ابھی چلنا ہو گا ضروری ہے“

”اچھا تو میں تیار ہواؤں۔“ ایلی نے سوچتے ہوئے جواب دیا  
”دیر نہ لگانا“ شفیع نے اسے تاکید کی۔

ایلی تیار ہو کر آیا تو وہ سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ محلے سے باہر نکلتے ہی ایلی نے سوالات کی بھر مار کر دی:

”آصف تمہیں کیسے مل گیا؟ گیا تم چھٹیوں میں باہر نہیں گئے تھے کہیں؟ خود کیوں نہ آیا آصف؟ تمہیں گھر کا پتہ کیسے مل گیا؟ مجھے اس نے کیوں بلایا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟“

شفع ایلی کے سوالات سے کھبر آگیا۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کا جواب نہ دیا بلکہ جواب دینے کی بجائے اس نے اپنا قصہ چھیر دیا کہنے لگا ”بات یہ ہے کہ آصف کو ایک لڑکی سے محبت تھی؟“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا ”ہاں اسے محبت ہو گئی تھی،“ شفع نے لہا ”لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق،“ ایلی نے منہ پکا کر لیا۔

”کسی سے بات کرنا اس کی حادث میں داخل نہیں تھا،“ شفع نے آہ بھری ”پھر اس نے تم سے بات کیسے کی۔ تمہیں یہ راز کیسے بتا دیا آصف نے؟“ ”بے چارہ مجبور ہو گیا ہو گا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے پوری بات نہیں کی،“ شفع نے کہا ”کیا بات کی تھی تم سے آصف نے؟“ ایلی اپنی لालمی کا اظہار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”مجھ سے،“ شفع خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ہلک آیا۔ ”شفع،“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ”تم رو رہے ہو؟“ ”نہیں،“

شفع نے مسکرانے کی کوشش کی دراصل میری آنکھیں دھکتی ہیں۔ پانی گرتا ہے۔

آصف نے مجھے گھر بلا بھیجا تھا کہنے لگا۔ شفیع کیا تم ایلی کو بلا سکتے ہو۔ اگر ایلی نہ آیا تو تو وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح وہ بات کرتا ہے تم جانتے ہی ہو شفیع نے پھر بات شروع کی۔

”ہاں مجھے معلوم ہے“ ایلی نے کہا ”اچھی طرح معلوم ہے“  
”پھر اس نے میری شفیع کیس، شفیع کہنے لگا“ لیکن میں نہ مانا۔ میں نے کہا جب تک بلا نے کی وجہ نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گا۔ پھر اس نے بتایا مجھے کہنے لگا میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایلی نہ آیا تو سمجھ لو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔“  
”بے قوف“ ایلی چلا�ا۔ مصیبت اڑکی سے ہے لیکن ایلی نہ آیا تو سمجھ لو زندگی ختم ہو جائے گی عجیب بے قنے سے بات ہے۔“  
”نہیں ایلی“ شفیع نے اس کا با تھوپ پڑایا۔ وہ واقعی تکلیف میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”حالت اچھی نہیں“ ایلی چلا�ا۔ ”اچھا خاصا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ حالت اچھی کیوں نہیں؟“  
”نہیں“ شفیع رک رک کر کہنے لگا۔ ”اب تو بے چارہ ختم ہو گیا منہ زرد ہو گیا ہے۔  
آنکھیں نکل آئی ہیں۔ پیچا نا تک نہیں جاتا۔“ شفیع نے کہا  
”کیا واقعی؟“ ایلی سوچ میں پڑ گیا  
”ہاں اب شاید وہ فتح نہ سکے“ شفیع نے بھرا لی آواز میں کہا  
”فتح نہ سکے تم بھی حد کرتے ہو“ ایلی بولا  
”سچ ایلی“ شفیع نے سر جھکایا۔

شفیع کے انداز کی سنجیدگی کی وجہ سے ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شفیع کی بات کی کچھی اڑادے مگر ہمت نہ پڑی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی طاقت گویا لی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ جیسے اس کی رگوں میں خون جنم گیا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور وہ

دونوں نہ جانے کب تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایلی گاڑی کی کھڑکی کے باہر دوڑتے ہوئے دیہات کے منظر کی طرف کھوئے کھوئے دیکھا رہا اور شفیع کی دھنچی آنکھ سے قطرے گرتے رہے۔

دنلما گاڑی کو دھپکالا کا اور وہ رک گئی۔ امر تسری کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر ایلی جیران رہ گیا۔ اسے یادی نہ تھا کہ وہ امر تسری جا رہا ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ شہزاد اس وقت بیٹھی مشین چلا رہی ہو گی۔ اسی طرح سر جھکائے بازوں کا تھے۔ اس وقت ایلی کے ذہن میں ایک وسیع خلا پھیلا ہوتھا۔

مشین میں وہ دونوں تانکے میں سوار ہو گئے تھے جو دوں دونوں خاموش ہو گئے تھے جیسے انہیں ایک دوسرا سے پچھنے لہننا ہے۔

جب وہ آصف کے گھر کے قریب پہنچنے والے شفیع نے مہر سکوت لاؤڑا۔

”ایلی،“ وہ بولا

”جی،“ ایلی چونکا

شفیع رک گیا جیسے یاد نہ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہتا ہے ”آصف کی حالت بہت خراب تھی بہت خراب اس حد تک کہ شاید“

”سب ٹھیک کر لوں گا میں،“ ایلی چمک کر بولا

”شاید وہ،“ شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”شاید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،“ ایلی نے اس کی بات کاٹ کر کہا گلی کا موز مرڑتے ہی ایلی جیران رہ گیا۔ وہ تنگ گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھڑکیوں میں، منڈریوں پر عورتوں کا ہجوم تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہاں غدر ہو گیا ہو۔ لوگ چلا رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے ہٹ کر شفیع سے پوچھا

شفیع نے ایلی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو پھر تا ہوا آگے

نکل گیا۔ آصف کے مکان کے نیچے وہ رکا جہاں لوگوں کی بھیڑگی ہوئی تھی۔

”ایلی آگیا ہے، وہ چیخ کر بولا

”ایلی آگیا ہے“ اوپر سے زنانہ آوازیں آئیں اور پھر دفعتاً لوگوں کی دلدوڑ چینیں سنائی دیں۔ ایک قیامت نوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے چینوں کی آوازیں آنے لگیں

”وہ آگیا ہے وہ آگیا ہے“

”ایلی آگیا ہے مگر تو پلا گیا ہے۔ لے میئے آگیا ہے تیرا وست۔ اب اس سے تو بات کر۔ آصف تیرا وست تجوہ سے ملنے آیا ہے اللهم سے تو تو نے کبھی بات نہ کی کیا اس سے بھی بات نہ کرے گا۔ ایلی میئے! تیرا آصف چپ ہو گیا ہے۔ اب وہ نہیں بولتا ب وہ کبھی نہ بولے گا“

پھر وہ چینیں سنائی دینے لگیں جنہیں سن کر ایلی سن ہو کر رہ گیا۔ جیسے وہ ایک بے جان چیز ہو۔ اس کے گرد چاروں طرف چینوں سے بھرا ہوا ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ اسے میالے وہبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ دور کوئی بین کر رہا تھا اور سینکڑوں مدھم مدھم آوازیں کراہ رہی تھیں۔

### نگلی رقص

پھر دفعتاً کوئی چلا یا ”ہٹ جاؤ جنازہ آرہا ہے“

اور وہ وہبے ہوا میں تیرنے لگے۔ چاروں طرف سے عجیب عجیب آوازیں بلند ہوئیں۔ بے معنی آوازیں پھر وہ سب ایک کھلے میدان میں کھڑے تھے جہاں ایک خوفناک سنا نا چھایا ہوا تھا۔ آسیب زدہ مکان میں بھوت پریت چل پھر رہے تھے۔ میدان میں قبروں کے درمیان کھلے بالوں والی ایک خوبصورت ڈائن کھڑی تھی۔ اس نے اپنی چھاتیوں پر سے تمیض اٹھا رکھی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شرارے بھوت رہے تھے اور وہ رقص

کر رہی تھی۔ مرت بھرا قص و حشت بھرا قص لوگ اس کے وجود سے بے خبر سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے۔

پھر دفتار ایک شور برپا ہوا۔ وہ دلدوڑ چینیں وہ ہچکیاں کرائیں بند ہو گئیں۔ وہ نہ جانے کہ ہر کو چل پڑے۔ ایلی نے محبوس کیا جیسے ان کے آگے آگے وہی نگلی رقصہ ناچتی جا رہی تھی۔

پھر وہ نماز پڑھنے ہے تھے اور وہ امامت کر رہی تھی۔ وہ لاش کو دفتر میں تھے اور وہ تھقہ لگا رہی تھی۔

”ایلی،“ شفیع نے اسے آواز دی ”چلو کھر چلیں“  
ایلی نے نقی میں سر ہلا دیا  
”تو کیا تم علی پور جاؤ گے؟“ شفیع نے پوچھا ”اس وقت؟“

”ہاں“ ایلی نے جواب دیا ”میں جا رہا ہوں“

”اچھا تو چلو میں تمہیں سیشیں پر چھوڑ آؤں گا“ وہ بولا  
دعاً ایلی نے شفیع کی طرف دیکھا  
”شفیع“ وہ بولا کیا واقعی آصف مر گیا؟

شفیع نے اثبات میں سر ہلا دیا  
”لیکن لیکن تم تو کہتے تھے“ ایلی رک گیا  
”میں میں،“ شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی ”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن“  
”تمہیں معلوم تھا کہ؟“ ایلی نے پوچھا

”ہاں“ اس کی دھنی آنکھ سے پانی جاری ہو گیا ”آصف نے مر تے وقت وصیت کی تھی کہ تمہارے آنے سے پہلے اس کا جنازہ ناٹھایا جائے۔“

ایلی روپ کر رہا۔ وہ پھیلا ہوا دھنڈ لکا دھنڈا ختم ہو گیا۔ اس کی گرد اوپنچے لمبے لوگ بھاگ رہے تھے۔ ڈراؤنے مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

”وصیت“ ایلی گنگنیا

”ہاں“ شفیع بولا ”آصف نے کل رات زہر کھایا تھا“

”زہر؟“ ایلی کے ہونٹ پہلے

”رات کے دو بجے وہ مر گیا اور مر نے پہلے اس نے گھروالوں سے کہہ دیا کہ جب تک تم نہ اچھا زندگی کر جائے۔ صبح اس کے گھروالوں نے مجھے بلا کر علی پور بھیج دیا تا کہ تمہیں نہ آؤ۔“

”زہر کھایا؟“ ایلی اپنے آپ ہی بڑھا رہا تھا۔

”کہتے ہیں“ شفیع نے کہا ”اس لڑکی نے آصف کو خط لکھا تھا۔ آؤ ہم اکٹھے زہر کھائیں۔ فلاں دن فلاں وقت اور رومن ان مرجائیں“

”اور وہ بھی مر گئی کیا؟“ ایلی نے پوچھا

### انتقام انتقام

”نہیں،“ شفیع بولا ”وہ نہیں مری کوئی کہتا ہے اسے کھانے کو زہر نہیں ملا۔ کوئی کہتا ہے وہ دراصل آصف سے انتقام لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے اسے دھوکا دیا۔ اس لڑکی کی بے حد بد نامی ہوئی تھی نا۔ اور اس کے بھائیوں نے اسے باندھ کر پیٹا تھا۔ پھر وہ اس محلے سے اسے لے گئے تھے۔ دور کسی اور محلے میں سفید کشوے کے قریب لیکن سچی بات کے متعلق کسی کو نہیں معلوم، شفیع نے کہا ”میرا خیال تھا شاید تمہیں معلوم ہو گا“

”مجھے“ ایلی سوچ میں پڑ گیا ”سب بیکار ہے بالکل بے کار کوئی فائدہ نہیں“ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ خود آصف کی موت کا ذمہ دار ہو جیسے اسی نے آصف کو مارا ہو۔ ان اوپنی عمارتوں کے اوپر ایک حسین لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی تمیض کے دامن کو نیچے کنوں سے پکڑ لیا اور پھر بازو اور اٹھائے۔ اوپر اور اوپر جتی کر وہ ننگی ہو گئی اور آصف اسے دیکھ کر چلانے لگا ”نہیں نہیں نہیں نہیں“ پھر اس کا

رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ بھوت بہن گیا اور لوگوں نے اسے سفید لکھے میں  
لپیٹ دیا۔ اور کسی نے با آواز بلند چلا کر کہا ”مہٹ جاؤ جنازہ آ رہا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں، شفیع بولا“ اس لڑکی نے واقعی آصف سے انتقام لیا ہے کیونکہ  
آصف نے اس کی طرف اتناث نہ کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ دونوں چار ایک بار  
چوری چوری ملے بھی تھے۔ کچھ کہتے ہیں نہیں لڑکی کی شوق ملاقات سے روپی رہی  
لیکن آصف نے اپنی بے تو جنی سے اسے بھسم کر دیا اس کے وہ انتقام پر قل گئی۔  
کہتے ہیں اگر لڑکی کے پیار کو حکرا دو تو وہ انتقام لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر اس کی  
آرزوں میں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہے۔ شفیع نے وضاحت کی۔

”انتقام لیتی ہے انتقام لیتی ہے،“  
گاڑی کا انجمن چلاتا ہوا جا رہا تھا۔

کھیتوں میں ایک برہنہ عورت نایق رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ چھاتیاں  
ابھری ہوئی تھیں۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔

”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے،“ انجمن گویا ایلی کو ہمکیاں دے رہا تھا ”انتقام  
لیتی ہے انتقام لیتی ہے۔“

دفعاً برہنہ عورت کے چہرے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایلی نے اسے پہچان کر جیخ  
سی ماری: ”شہزاد، اس کا جسم پسینے سے شر ابور ہو گیا۔“

”کیا ہے تمہیں بابو،“ اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اس کی طرف دیکھ کر  
پوچھا

”بیمار ہو بھائی؟“ دوسرے نے پوچھا  
ایلی گھبرا گیا

”ہاں، وہ بولا“ میری طبیعت ٹھیک نہیں“  
لیٹ جاؤ لیٹ جاؤ انہوں نے زبردستی اسے لٹا دیا۔

وہ بہنہ عورت تیرتی ہوئی کھیتوں سے گاڑی میں گھسی اور اس کی چھاتی پر بیٹھ گئی۔  
”انتقام انتقام“ گاڑی چلانے جا رہی تھی۔ روپ کروہ اٹھ بیٹھا، انتقام انتقام شفعت  
دور سے مکرا کر بولا ”اگر اس کی خواہشات پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔“  
بہنہ شہزاد کے کھلے بال ایلی کے چہرے سے مس کر رہے تھے ”انتقام انتقام“  
انجمن اسے خبردار کر رہا تھا۔ ڈبے کے سمجھی مسافر حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔  
”خوبیں نہیں“ وہ چلایا ”خوبیں نہیں“  
”کیا ہے تمہیں؟“ کسی نے قریب آ کر پوچھا اور اس کے جسم کو ہاتھ لگا کر بولا ”  
اسے تو بخار ہو رہا ہے، نہیں نہیں ایلی چلایا ”بخار نہیں بخار نہیں“  
پھر اسے ہوش آیا تو وہ چار پانی پر ایٹھا ہوا تھا۔ اس کے گرد کئی ایک دھنڈ لائے  
ہوئے چہرے تھے۔ دھنڈا ایک چہرہ اس کے قریب تر ہو گیا کھلے بادلوں میں گمرا  
ہوا۔ گھبرایا ہوا۔

”شہزاد“ اس کے ہونٹ کھلے۔ اسے دیکھ کر جو شہزادے کی کوشش کی  
گئی، اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی  
شہزاد ہنسنے لگی ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“  
”نہ جانے بیویو میں کیا بول رہا ہے،“ ہاجرہ بولی ”دیکھو تو بخار سے بدنتپ رہا  
ہے۔“

”کیا ہے تمہیں ایلی؟“ شہزاد نے پوچھا  
”کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں“ ایلی خاموش ہو گیا  
پھر جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے شہزاد کو آواز دی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔  
”کیا ہے ایلی؟“ وہ قریب آ کر بولی  
”تم مجھ سے انتقام تو نہ لوگی“ ایلی نے پوچھا  
”انتقام کیا کہہ رہے ہو تم؟“ شہزاد گھبرا گئی

ایلی نے شہزاد کا بلوری پاؤں پکڑ لیا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ہائیں، شہزاد چلائی“ تم رو رہے ہو؟“

” وعدہ کرو شہزاد وعدہ کرو“ وہ منت کرنے لگا“ تم مجھ سے انتقام نہ لوگی وعدہ کرو“

”پا گل نہ بنو“ وہ بولی

”خوبیں نہیں وعدہ کرو“ ایلی منت کی

”خوبیں میں تم سے انتقام نہ لوں گی“ شہزاد بولی ”اب نہ رہو“ وہ اسے تھکنے لگی اور

وہ اس کے بلوری پاؤں پر سڑ دکھے روتار و تاسو میالا اللہ

نئی الجھن

شہزاد کے اس وعدے کے باوجود ایلی کے دل میں انتقام کا خوف جوں کا توں قائم

رہا۔

اگرچہ شفیع نے اس روز وہ بات سرسری طور پر کی تھی مگر ایلی کے دل میں وہ بات گھر کر گئی۔ اور پھر نہ جانے آصف کی موت کی وجہ سے یا امر تسری کے لوگوں کی سرگوشیوں کی وجہ سے وہ بات ایلی کے دل کی گھرائیوں میں اتر گئی۔

جب بھی ایلی شہزاد کے پاس جاتا تو شفیع نہ جانے کہ ہر سے آنکھتا اور مسکرا کر کہتا:

”اگر عورت کی آرزوں میں پوری نہ کی جائیں“ دفعتاً اس کی مسکراہٹ خوف ناک سنجیدگی میں بدلتی اور ساری دنیا پر سکوت طاری ہو جاتا۔ خوف ناک سکوت۔ اور پھر فاصلے پھیلتے اور شہزاد کو سوں دوڑ ہو جاتی اور وہ بڑھتی جانو منظر سے خارج ہو جاتی۔

اکثر اکیلے میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ مجھے اچھا سمجھے۔ چاہتا تو بات ہی اور ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا خاوند ہی جو چھت پر آنکھیں گاڑنے کے باوجود شہزاد کی ہر بات پر مسکرا دیتا ہے اور جب بھی اس کی طرف دیکھتا

ہے تو اس کے ہونٹوں سے لعاب کا تار نکل آتا ہے جیسے شہزاد مٹھائی کی لُوکری ہو۔ ایسے خاوند کو چھوڑ کر ایسی سے محبت کرنے میں اسے کیا فائدہ ہے۔ ایسی کانات ک نقشہ حسین نہ تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ رنگ سیاہ تھا جس میں چوڑے چوڑے زرد و انتہا بیانیت بد نمائیت تھے۔

ایسی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس دور میں ایسی کے خیالات روایتی رنگ لئے ہوئے تھے۔ بہت سے روایتی اعتبار اس کے دل میں جائزیں تھے جن کی صحت کے متعلق اسے بھی شک نہیں پڑا تھا۔ شک بھی کیسے پڑتا؟ یہ دو راستے اس عمر کا وہ دوست تھا جب کہ اس کے والدین، اس کے بزرگ اور محلے کے بوڑھے اسے ایک بچے کے زیادہ حیثیت دیتے گے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تجربہ سے بڑی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ جب علم اور فکر کی کوئی حیثیت نہ تھی اور انفرادیت دیوانگی کے متراوف بھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں شادی ہو جانے کے بعد دفعتاً لوگ معز زبن جاتے تھے اور انہیں یہ حق حاصل ہو جاتا کہ وہ جملہ حقائق پر تبرہ کریں اور کنواروں کو صراط مستقیم کے متعلق سمجھائیں۔

اس کے والد علی احمد جب بھی ایسی کے متعلق اظہار رائے فرمایا کرتے تو ان کے انداز سے تحقیر کا عصر واضح ہوتا۔ ان حالات میں وہ بھلا زندگی کے مسائل کے متعلق خود پوچھنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ اسے کیسے یقین آ سکتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے نزدیک شہزاد کے قرب کی آرزو کرنا بھی جائز نہ تھا۔ اس خیال پر ہی وہ چونک جاتا اور نہ امت محسوس کرتا۔ چونکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے شہزاد کو چھوටا تو وہ میلی ہو جائے گی۔ ناپاک ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ایسی کی خواہش تھی کہ وہ شہزاد کو دور سے پیار کرے ایسی کے سجدے، شہزاد کے لٹکنے والے بازوؤں، اس کے رنگین گدے سے ہاتھوں اور اس کے بلوری پاؤں تک محدود رہے۔ مگر اس کی محبت کی راہ میں ایک نئی مشکل حائل ہو گئی تھی۔ ایک ایسی

مشکل جس نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

## جلتا بجھتا سائنس بورڈ

جب وہ شہزاد کے پاؤں پر جھکاتا تو چپکے سے شفیع کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے قریب آ جاتا۔ اگر عورت کی آرزو میں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سفید کفن میں لپٹا ہوا آ صفحہ منہ سے پو اٹھا کر یوں بے بی سے مسکراتا جیسے شفیع کی بائیں میں ہاں ملابہ ہو۔ ایلی چونکہ کراٹھ بیٹھتا اور پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر اس کی بے نیازی اور بے پرواہی کو محسوں کر کے یہ سمجھنے لگتا کہ شہزاد کی آرزو میں پوری نہیں ہو رہیں۔ پھر وہ گہری سوچ میں پر جاتا ہاں جھی وہ تخلیہ میں اس سے دور ہو جاتی ہے اور دوسری بائیں اسے آکھاتی ہے جسی وہ تہائی میں یوں بے پرواہ ہو جاتی ہے جیسے ایلی کے وجود کا اسے احساس ہی نہ ہو۔ اور فرحت، ہاجره اور جانو کے سامنے بہانے بہانے اس کا دامن کھینچتی ہے۔ چوری طوری اس کا گال سہلا جاتی ہے یا چلتے چلتے چکلی بھر لیتی ہے۔ ظاہر ہے وہ سوچتا کہ تخلیہ میں ایلی کو چون تپسیہ کرتے دیکھ کر وہ ما یوس ہو جاتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں پھر سے امید کا دیپ جلا لیتی ہے۔

ان دنوں ایلی یہ نہ جانتا تھا کہ عورت کے لئے محبت محض ایک ماحول ہے۔ چون تپسیہ بھری نگاہوں اور رومان بھرے خوابوں سے بنا ہوا ماحول۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ عورت کو مردانہ جسم کی خواہش ختمی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت ایک ڈنی تاثر ہے۔ جسم کو وہ صرف اس لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ ٹلسمن نہ ٹوٹے۔ وہ تپسیہ بھری نگاہیں گم نہ ہو جائیں لیکن ایلی شہزاد کی بے نیازی کو ما یوسی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ بے نیازی احساس تغیر و مسرت کا بے پایاں اظہار تھی۔

ایلی ان باتوں کو سمجھتا بھی کیسے؟ اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ زبان خلق فقارہ خدا ہوتی ہے۔ اور خدا کا فقارہ کبھی دروغ بیانی کر سکتا ہے بھلا؟ اس نے اپنے دوستوں کے

علاوہ کئی بار چھپ چھپ کر بزرگوں کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ عورت کی آرزوں میں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لےتی ہے۔ اور ان آرزوں کے متعلق کئی بار علی احمد نس کر کہا کرتے تھے؟

”ان عورتوں کی کیا پوچھتے ہو میاں، یہ قربت تک تمہاری ہیں جب تک تمہاری گرفت میں ہیں۔ ہاتھ سے نکل گئیں تو پھر تم کون ہم کون؟“  
اس نقارہ خدا کے باوجود ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے حقیقت تسلیم کر لے۔  
کیا عورت کی آرزو یہی ہوتی ہے؟ کیا شہزادی یہی چاہتی ہے؟ نہیں نہیں وہ جھلا لختا۔  
شہزادی نہیں۔ وہ عام عورتوں نہیں وہ بھی ایسی بات کی آرزو نہیں کر سکتی۔

اس کے باوجود دل ہی دل میں لواؤں کی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اس کش کمش میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ٹوٹا رہا لیکن دوسرا ساعت میں سورج کی منور کرنیں اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتیں اور وہ پھر سے اندھا ہو جاتا۔ اس کی کیفیت اس بجلی کے سامنے بورڈ کی سی تھی جو ایک ساعت میں روشن ہو جاتا ہے اور دوسرا ساعت میں بگھ جاتا ہے۔

## عزم

نقارہ خدا کے شور کے باوجود شاید ایلی بھی اس راہ پر گامزنا نہ ہوتا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزادی کرتا کرے اپنے ہاتھ سے پھینک نہ دے۔ وہ بھی کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر شہزادی سے قطع تعلقی اسے گوارا نہ تھی۔ اگر شہزادی کی آرزوں کو قرب سے تعلق نہیں تو قرب کی کوشش سے وہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہو گی نا مایوس تو نہ ہو گی اس کے دل میں ایک خاموش عزم پیدا ہو گیا۔ گویا ایک نہتے رخی سپاہی نے حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

کئی ایک روز وہ سوچتا رہا۔ اس کا یوں سوچتے رہنا شہزادی کے لئے خاصا پریشان کرنا تھا۔ وہ بار بار پوچھتی ”ایلی کیا ہے تجھے؟“

”سچ نہیں“ ایلی جواب دیتا

”نہ“ شہزاد اشارہ کرتی ”یوں سوچ پچار میں نہیں پڑا کرتے۔ جب سے امرتر سے آئے ہونے جانے کیا ہو گیا ہے تمہیں“

شہزاد کو آصف کی موت کا پتہ تھا اور اسی لئے وہ ایلی کے متعلق فکر مند تھی۔ وہ دن میں کئی ایک بار فرحت گئے ہاں آتی تاکہ ایلی کا پتہ لگائے۔ ہر بار وہاں آنے کے لئے وہ نئے سے نیا بہانہ تلاش کرتی۔ اور ہر بار فرحت طنزابات کرتی جسے سن کر شہزادی نہیں دیتی۔ پھر وہ ایلی کے قریب آ جاتی:

”کہو جی کیا بھی تک جنون نہیں گیا؟“ وہ نہیں کہا پوچھتی ایلی مسکرا دیتا ”جنون بھی بھی جاتا ہے؟“

”اچھے امرتر گئے تم اب چارپالی چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے“ وہ نہیں لے، باجرہ کہتی ”وہ تو اس حالت میں بھی تمہاری طرف جانے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔“

”پتہ نہیں“ فرحت مسکرا نے لگتی ”شہزاد نے کیا جادو کر رکھا ہے ہم سب پر“

”جادو تو ہو گا“ شہزاد آنکھیں چمکا کر کہتی

”مجھے بھی سکھا دو“ فرحت بات بد لئے کی کوشش کرتی۔

”اونہوں یہ منہ اور مسور کی وال تم سے اتنا تو ہو نہیں سکتا کہ خاوند کو کابل سے بلوں سکو۔“

”سچ کہتی ہو“ فرحت جل کر کہتی ”یہ منہ اور مسور کی وال“

”اونہہ“ شہزاد آنکھیں چمکاتی ”خالی منہ سے کیا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی شکل و صورت والیاں اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی ہیں“ پھر وہ بات بدلتی ”یہ ایلی پڑے پڑے کیا سوچتا رہتا ہے؟“ تمہارے متعلق ہی سوچتا ہو گا فرحت پھر وا رکرتی۔

”کیوں ایلی میرے متعلق سوچتے ہو؟“ شہزاد ایلی پروہی زگاہ ڈالتی ”جواب دو“

”ہاں تمہارے متعلق“ ایلی ہفتا

”اب کی بار آئیں وہ ان سے شکایت کروں گی۔ پھر مکر نہ جانا،“ شہزاد بخیدگی سے کہتی۔

”ان کو تو تم نے جان بو جھوکر بایہ پنج رکھا ہے،“ فرحت چیختنے  
”ہے نا،“ شہزاد اپنے تھیڈے اب تو مجھے مانو گی نا۔“

”اب تو بہت دیر ہو گئی کب آئے گا شریف؟“ باجرہ بات بد لئے کی خاطر پوچھتی  
”کیا معلوم کیب آئیں گے،“ شہزاد مسکراتی  
شریف کا نام سن لرائیں کا احساس گناہ جاگ افحتا۔ اس کے سینے پر بھیں لگتی اور وہ  
مزید سوچ میں پڑ جاتا۔ 2002-2005  
@ 2002  
سوچ بچار

امر تر سے واپسی کے بعد چار ایک دن ایلی نے چار پالی پر گز اردو یعنے ویسے تو وہ  
چل پھر سکتا تھا اور شہزاد کی طرف جاسکتا تھا مگر اس نے جان بو جھوکر ادھر جانے سے  
احتراز کیا۔ ادھر جانے میں رکھا ہی کیا تھا۔ وہاں شہزاد کے قریب پہنچ کر تو وہ بالکل ہی  
معدوم ہو جایا کرتا۔ پھر ادھر جانے سے فائدہ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ ادھرنے جاتا  
تو شہزاد بار بار فرحت کی طرف آیا کرتی اس کی نگاہ کی اس اذیت و بے انتہائی سے  
نجات ملی ہوتی تھی۔

مسلسل سوچ بچار کے بعد ایلی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خوشی سے وہ اچھل  
پڑا۔ اور پھر اطمینان سے تفصیلات پر غور کرنے لگا۔

”واہ واہ کیا تجویز ہے؟“

وہ حیران تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا  
پھر از سر نواس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے  
”اگر شہزاد نے برا نہ مانا تو اگر وہ نا راض ہو گئی تو اگر کسی نے دیکھ لیا تو اگر بات

شریف تک پہنچ گئی تو!“

شہزادی منزل پر چو بارے میں رہتی تھی لیکن سب سے نجی منزل میں ڈیورٹھی سے ملحقہ ایک بیٹھ کی ہوئی تھی جو شریف کے قبضے میں تھی اور جہاں انہوں نے گھر کا سامان بند کر کھا تھا۔ بیٹھ گردوارہ سے بند پڑی تھی کبھی کبھی کھار شہزادہ وہاں کوئی چیز رکھنے یا لادنے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ایلی نے بیٹھ میں کپڑے کی آرام کر سیاں رکھی ہوئی دینکھی تھیں۔

دو پھر کو جب شہزادہ ایلی تو ایلی نے چپکے سے اس کی چابیاں اڑا لیں۔ جب وہ چلی گئی تو وہ چپکے سے امتحا۔ شہزادہ کی بیٹھ کا قفل لکھا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی اندھرے پر چھپنی گول دی۔ ایکن پشت جوں کے توں بند رہنے دیئے۔ پھر بیٹھ کے دروازے پر تالہ لگا کرو اپس آگیا۔

اگلی روز جب شہزادہ ایلی اور حسب معمول قریب آ کر زیرِ لب بولی:

”اڑھرنے آؤ گے کیا؟“

”اؤں گا“، ایلی نے جواب دیا ”بشر طیکہ“

”اوہ اب شرطیں لگانے لگے“، شہزادے آنکھیں چمکا کر کہا

”ہاں“، وہ مسکرا یا ”شرطیں ہی لگائیں گے“

”اچھا“، شہزادہ نے لگی ”کیا شرط ہے؟“

”وہاں میں کپڑے کی ایک آرام کرسی میں بیٹھوں گا“، ایلی نے معصوم اندھرے کہا ”بس اتنی سی بات ہے میں ابھی جانو کو بھیجنی ہوں نیچے سٹور میں وہاں رکھی ہیں وہ کر سیاں ابھی لے آئے گی یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

ایلی نے نفی میں سر ہلا کیا:

”جانو کو نہ بھیجننا وہ با تینی بنائے گی۔ خواہ نخواہ طعنے دے گی۔“

”اچھا تو“، شہزادہ بولی ”میں خود لے آتی ہوں اتنی سی بات تھی۔“

ہستے ہستے وہ آنھی اور فرحت کو چھیڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ اسے جاتے دیکھ کر پہلے تو ایلی کا دل گھبرا گیا۔ پھر ہمت کر کے دیوانہ واراثٹا اور دوسرا راستے بیٹھ کی طرف بھاگا تاکہ شہزادے کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کھلی کھڑکی کے ذریعے کمرے کے اندر جا پہنچ۔

ایلی کی تجویز کا درجہ چھی تھی لیکن عین موقعہ پر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کی روح کی گہرائیوں سے نفرین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ محبت کی تسلیمیں کرو رہا ہو۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ دوسرا کی بیوی سے محبت کی جذبات و ابلاتھ کرنا اس کے زندگیکے قابل نفرین نہ تھا۔ مگر محبت میں جسمانی ملادپ کی خواہش کرنا یقیناً گناہ تھا۔

ذہنی طور پر ایلی سمجھتا تھا کہ محبت دراصل ایک فطری تقاضا ہے۔ ایسا فطری تقاضا جس میں جسمانی قرب ضروری ہے مگر جذباتی طور پر وہ سمجھتا تھا کہ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایک روحاں لگاؤ جو جسم کی آلاش سے قطعی پاک ہے۔ یوسف زینا، ہیر رابنخا اور کسی پنوں کے قصے سن کر اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں محرومی کا غصر لازم ہوتا ہے اور جس کا نتیجہ موت ہوتا ہے۔ ان قصوں کے علاوہ علی احمد کے کمرے کے قرب میں رہ کر اسے جسمانی محبت سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی محبت جس نے اسے والد کے قرب اور اس کی محبت سے محروم رکھا تھا۔

### بند بیٹھک

ان خیالات کے باوجود ایلی دیوانہ وارثہزادے کی بیٹھک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں شہزادے کے حسین جسم کا شوق نہ تھا بلکہ جب بھی اسے اس کا خیال آتا تو وہ گھبراہٹ سی محسوس کرتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ چاند کو میلا کر رہا ہو۔ اسے اپنے جسم سے نفرت تھی۔ اسے اپنی جسمانی کمتری کا شدت سے احساس تھا لیکن ان سب

باتوں کے باوجو وہ آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اس کے روپ و شفیع مسکرا رہا تھا ”ان کی آرزوؤں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہیں۔“

بیٹھ کے پاس پہنچ کر اس نے دھڑکتے دل سے کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے احتیاط سے کھڑکی کے پٹا بند کئے اور کباڑ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، چند میزیں کریاں اور دیگر سامان گرد سے اٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کہ سے وہ کمرہ بند پڑا تھا۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے تنہ ہوئے تھے۔ مکڑے بڑی بڑی نالیں پھیلائے دیواروں پر بیٹھے تھے۔ ہر جگہ اگر دی کی تہہ بھی ہوئی تھی۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ ایک بھی ہوئی چار پائیں کے بینچے دیک کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کوئی میرھیاں اتر رہا تھا۔

”اوہ ہوں پاؤں کی چاپ میں بھداپن واضح ہے وہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدموں کی چاپ میں ایک لے ہوتی ہے۔“

پاؤں کی چاپ تقریب تر ہو گئی پھر وہ آواز مدم پڑ گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے اطمینان کا سنس لیا۔ اس کے دل کا ایک حصہ دھائیں مانگ رہا تھا کہ شہزادہ آئے۔

وہ غور سے اوپر کی منزل کی آوازیں سننے لگا۔ شہزادہ کا چوبارہ اوپر تیسری منزل پر تھا اس لئے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ درمیانی منزل میں عام طور پر سعیدہ رہا کرتی تھی جو ان دونوں اپنے خاوند کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اب وہاں اکیلی رابعہ رہتی تھی۔

رابعہ اپنے بیٹھے کے ساتھ با تین کر رہی تھی ”خبردار اسے ہاتھ نہ لگانا نہ تجھے جو کہا ہے بڑا پیارا بیٹا ہے یہ“  
پھر خاموش چھا گئی

ایلی نے محسوس کیا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اسے اس بند کمرے سے خوف آنے لگا۔ باہر چوگان کی طرف سے شور سن کروہ چونکا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے وہاں چھپنے کا راز آشکار ہو چکا ہو۔

اور وہ سب اس کمرے کی طرف آرہے ہوں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس مٹی سے ٹھوئے کباڑ خانے میں ایلی ایک قیدی کی طرح دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ان حالات میں وہ اپنی محبوبہ شہزاد کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کی آرزوؤں کو اپورا کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے۔ اور محبوبہ بھی وہ جو پہلے ہے ہی کسی اور کی تھی جو ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بننے پکی تھی اور اس کا آپنا ول اس کے اپنے ارادوں پر نفرین بھیج رہا تھا اور دل ہی دل میں چوری چوری و معاہد میں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

دفعتاً شہزاد کی آواز سنائی دی۔ اس کی پیٹھ پر گویا ایک چوہا پھمد کا۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ شہزاد کی آواز میں نہ جانے والوں کیسے آ جاتا تھا۔ اس کے گلے میں تاریخ تار تھے۔ اور اس کی ہربات میں مینڈسی سنائی دیتی تھی۔ شہزاد کی آواز سن کر اس کے جسم میں جھانجیریں بجھنے لگیں۔

مگر اس وقت وہ آواز اسے یوں سنائی دی جیسے موت کی گھنٹی نجح رہی ہو۔ ایلی کا حلق خشک ہو گیا۔ ول میں وہنگی بجھنے لگی اور جسم منوں بوجمل ہو گیا۔

”کیا ہور جا ہے رابعہ؟“ اوپر کی منزل سے شہزاد کی آواز سنائی دی۔

”کہاں جا رہی ہے تو؟“ رابعہ نے پوچھا ”چاہیوں کا گچھا اٹھائے“

”ذریثے بیٹھک میں جا رہی ہوں کچھ چیزیں لانے کے لئے“

”جانو کو بھیج دیتی۔ وہاں تو ایک منٹ کے لئے بھر انہیں جاتا“ رابعہ کہہ رہی تھی۔

”جانو باہر گئی ہے،“ شہزاد بولی

”تو انتظار کر لیا ہوتا“

شہزاد بھی:

”وہ کہاں کرتی ہے ایسے کام“ یہ کہتے ہوئے وہ میرھیاں اترنے لگی۔

اپنے احساسِ کمتری کو دبانے کے لئے، احساسِ گناہ کو معطل کرنے کے لئے اور اس آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک طریقہ تھا جیسے گھرے ہوئے کبوتر کے لئے عقاب نہیں بچنے کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے۔ وہ مرکزِ عقاب پر جھپٹتا ہے اور یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ ایک کبوتر ہے۔  
جوں جوں آوازِ قریب تر ہوتی گئی۔ ایلی اپنے آپ میں وہی خود ساختہ وحشت پیدا کرنے کی تیزی کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں۔ پند بند جوش سے تھر کئے لگا۔ اور وہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے اس لئے سن رکھا تھا کہ ایسے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہئے اور مرد وہ ہوتا ہے جسکی وجہ میں وحشت اور بربریت ہو۔ وحشت اور بربریتِ عورتوں کو محبوب ہوتی ہے۔  
وروازہ کھلا۔ شہزادہ داخل ہوئی۔

ایلی بھلی کی ہی تیزی سے اپنی جگہ سے لکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگادی۔ شہزاد نے ڈر کر ایک ہلکی ہی چیخ ماری۔  
کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روپ و کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی ”تم یہاں“  
ایلی کی خاموشی اور وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی ”یہ سب کیا ہو رہا  
ہے؟ وہ بولی ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا  
”پا گل ہو گئے کیا؟“ وہ زیرِ لب چلانی  
وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی  
شدیدِ کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا روب پ چھپانے کے لئے  
اس نے شیر کی کھال پہنچنے کی مضمکہ خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے“ وہ چلائی ”مہٹ جاؤ یہ کیا دیوائیگی ہے“  
وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

”ضرور تم پاگل ہو گئے ہو“ وہ بولی ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو“  
”ہاں“ ایلی نے بھیا نک آواز میں جواب دیا ”نہیں ہوں“

”اے کون سن لے گا وہ کیجے لے گا، پاگل نہ بنو، پاگل نہ بنو، پاگل نہ بنو، پاگل نہ بنو“  
ایک رنگین دھنڈکا ایلی کے قریب تر آتا گیا۔ اور قریب اور قریب اور وہ دیوانہ وار  
اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہر اور کاخون چونے کے لئے جونک کی طرح  
آگے بڑھے۔ یاتھ بazaar و منہ صر جسم، وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چونے  
لگ۔ پہلے تو شہر اور نہ اپنے آپ کو اس کی الرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر وہ  
تھک ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر پڑی۔ بھیا نک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی  
میں نیا ایندھن دھکلنے کی کوشش کی۔

”چرارچرار“ رشمیں کپڑے کے سچلنے کی آواز آئی  
”اے پاگل نہ بنو“ ایک بار پھر مرمریں جسم میں حرکت ہوئی ”پاگل نہ بنو“  
مدھم آواز میں مہم سا احتیاج دیکھ کر وہ اور بھی بچھر گیا۔

وہ پ ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ اور معاگر ووپیش تاریک ہو گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھورا اندھیرا۔  
خفت، ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا چھوٹ چکا تھا۔ وہ  
دیوائیگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منقی احساسات کا  
ریلا املا آرہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو  
پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو منانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور شہر اور کے بند بند کو

چونے لگا۔ اور بالآخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا:

”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے“

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ چکی۔ اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھکنے لے۔

اس کیفیت میں کتنا تمیان تھا۔ ایلی نے محسوس گیا جیسے ماں کا با تھسرہ نش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد اسے تھک رہا ہو۔

جب وہ واپس گھر پہنچا تو وہ تھکا ہا راحر و مونا کام ایلی تھا۔ چکے سے چور کی طرح وہ اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں پھلتا ہوا اپنی چار پالی پر گر گیا۔ اس نے اپنا منہ بٹکیے میں گاڑ دیا اور ماہیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اگر ایلی اس پہلی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کی تمام تر زندگی کا رخ ہی بدلتا۔ ممکن ہے محبت اور عورت کے متعلق اس کے خیالات از سر نو ترتیب پاتے۔ جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایلی کا احساس کمتری اور بھی شدید ہو گیا۔ ول میں جسم کی نیزت اور بھی شدید ہو گئی۔ عورت کا ڈر اس کی روح پر خوفناک پر اسرار سائے کی طرح مسلط ہو گیا۔ اور محبت کے تخيیل میں چھوٹی روحاںیت کی ایک اور کلی لگ گئی۔

نہ جانے کب تک ایلی اسی طرح بٹکیے میں منہ گاڑے پڑا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا اس پر ثابت ہو چکا تھا کہ اس میں آرزوئیں پوری کرنے کی صلاحیت سرے سے ہی مفتوح ہے۔ اب شہزاد کا انتقام اور بھی یقینی ہو چکا تھا۔ اب وہ کس منہ سے شہزاد کے سامنے جا سکتا تھا۔ کس برتنے پر اس سے محبت جتا سکتا تھا۔

”نہیں نہیں میں اس کے روپ نہیں جاؤں گا کبھی نہیں جاؤں گا“

”محبے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں مجھ میں کوئی ایسی خوبی نہیں جو محبت کا حق دار بنا سکے۔ میری تمام تر زندگی ہی بیکار ہے۔“

آصف نے لشکھ کی سفید چادر کو منہ سے ہٹا کر ایلی کی طرف دیکھا اور مسکرا یا۔ معنی خیز مسکراہٹ جیسے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ اسے بلا رہا ہو ”آ جاؤ ایلی آ جاؤ“ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ باہر کلا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اس کے لیے اس کے

سو اکوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھاگ جائے کہیں دور بھاگ جائے۔ شہزاد کے چوبارے سے دور اس بیٹھ کے دور جہاں وہ شکست کھا کر منہ میں گھاس پکڑے سکندر کے روپ و حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے سر جھکا کر کھا تھا۔ حضور مجھ سے ایسا سلوک کیا جائے جو باادشاہ بھکاریوں سے کرتے ہیں۔

اے چوگان سے گزرتے دیکھ کر محلے والیاں چلانے لیں

”کون ایسا ہے بسم اللہ“

”شکر ہے تو بھی گھر سے باہر لکا“

”نہ بیٹا“ ایک بولی ”اپنے باپ کے قدموں پانہ چلانا سے ہی گھر میں بیٹھے رہنے کی عادت ہے۔“

”وسری بولی“ لو ماں تم بھی حد کرتی ہو یہ آج کل کی لاکیاں تو راہ چلتے کو بلاتی ہیں۔ جادو کر دیتی ہیں اس بیچارے کا کیا دوش ہے، بس پتھر کا بنا کر چوہبے پر رکھ لیتی ہیں۔“

”نہ بیٹا تو نہ پڑنا ان کے فریب میں“

”اللہ تعالیٰ کا فضل ہے بہن ابھی اس محلے کی لاکیوں پر اللہ اپنا فضل ہی رکھے ایلی چوگان سے لکا ہی تھا کہ سامنے رضا لٹھی شیکتا ہوا آ لکا۔“

”نکل آئے تھے خانے سے“ وہ مسکرا کر بولا“ کیسے آنے دیا اماں نے گود کے پٹ بند کر لئے کیا“

”بکونیں“ وہ بناوٹی غصے میں چلا یا

”بیٹا کچھ دن اور یونہی اندر رہے تو لاٹھی کے سہارے چنان پڑے گا۔ تجربے کی بات کر رہا ہوں“ رضا نے قہقہہ لگایا

”شرم تو نہیں آتی تمہیں“ ایلی نے کھیانے ہو کر کھا

”اوہبھوں“ رضا چلا یا ”شرم شروع شروع میں آتی ہے، جب لکڑی اٹھا لو گے تو

شرم نہیں آئے گی۔“

”جا کہاں رہے ہو؟“ ایلی نے بات بد لئے کی کوشش کی  
”ابھی آتا ہوں تمہیں فرصت ہوتی بیٹھنا فرار دوکان پر“ رضا بولا

## رسوائی

رضا کی دوکان تک پہنچتے پہنچتے کئی لوگ اے ملے وہ سب درپورہ اسے  
مشکوک نگاہوں نے دیکھ رہے تھے اور باتوں ہی باتوں میں بھی شہزاد کا طعنہ دے  
رہے تھے۔ اس نے اس روز اپنی دفعہ محسوس کیا کہ وہ راز جو وہ اپنے دل میں چھپائے  
بیٹھا تھا تمام محلے میں زبانِ خلق ہو چکا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ لرز گیا لیکن  
اب کیا تھا اب تو سب ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ شہزاد کے رو بردنہیں جا سکتا تھا۔ اس  
خیال پر اس کے دل کو ڈھارسی ہو گئی۔

کیپ کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر اسے ارجمند یاد آگیا جو نہ جانے اس تیل کے  
کارخانے میں کیسے دن گزار رہا تھا۔ کھڑکی میں کیپ کھڑی نہ جانے کس سے باقی میں  
کر رہی تھی۔ وہ رک گیا اور کیپ کو دیکھنے لگا کیپ نے اسے دیکھتے ہی کھڑکی کے  
پٹ زنائی سے بند کر دیئے

”اوہ“ اس نے سوچا ”تو بات اس حد تک پہنچ چکی ہے“  
کنوئیں کے قریب دو منزلہ مکان کے دروازے میں اپنی میگنیٹر کو کھڑے دیکھ کر  
ایلی چونکا۔

”جو ان ہو گئی ہے پچھلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو پچھی سی تھی۔ لڑکیاں جتنی جلدی  
جو ان ہو جاتی ہیں۔ رنگ کتنا نکھر گیا ہے اور اعضاء میں نہ جانے کیا بھر گیا ہے جیسے  
اٹے میں خیر اٹھ گیا ہو۔“ ارے، وہ تعجب سے چلا یا اسے دیکھ لینے کے باوجود قدرہ  
اسی طرح بازاوا پر اٹھائے ہوئے کھڑکی میں کھڑی رہی جیسے وہ ایلی کی حیثیت سے  
منکر ہونے کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھ کر ناک سکوڑی۔ اس کے

ہونٹوں کے کونوں میں طزدہ بی ہوئی تھی ایلی کھڑا سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ گویا اکتا گئی۔  
اس نے بے پرواںی سے مگر با معنی انداز سے حوك دیا اور پھر اندر چل گئی۔“

”ہوں،“ ایلی نے مسکرانے کی کوشش کی ”ہوں تو اب بات یہاں تک آپنی،“  
اگرچہ ایلی نے با ربار چلا چلا اگر لوگوں سے کہا تھا کہ ملکنی محض ایک بچوں کا کھیل  
ہے جو اماں نے صرف اس لئے رچایا تھا کہ اس کا دل کا چاہو پورا ہو جائے۔ اور  
اعلان کیا تھا کہ وہ وہاں بیان نہیں کرے گا مگر اس وقت اپنی ملکیتی کی بے پرواںی اور  
اظہار تحقیر کو دیکھ لے کر اس سے تکلین محسوس ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کی تو ہیں کی گئی  
ہو۔ اس خیال پر اس کا وہاں رکھنا مشکل ہو گیا اولادہ سیدھا رضا کی دکان پر پہنچا اور  
چکے سے دکان کے عقب میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

اس روزو محسوس کر رہا تھا کہ محلے سے بھی لوگ اس سے شاکی تھی۔ شہزادی کی بات  
دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ نہ جانے بات کیوں نکل گئی تھی۔ اس کا صرف یہی تصور تھا تھا  
کہ وہ سارا دن گھر بیٹھا رہتا تھا کیا اتنی سی بات پر وہ سب اس سے بدھن ہو چکے تھے  
کیا اتنی سی بات سے انہوں نے وہ سب کچھ اخذ کر لیا تھا۔ جیرانی کی بات ہے پھر اس  
کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے نہیں نہیں اتنی سی بات سے سب کچھ اخذ کرنا ممکن  
نہیں۔ شاید کسی نے انہیں دیکھ لیا ہو تو کیا بیٹھ ک؟ اس خیال پر اسے پیسہ آ جاتا۔  
محبت کے راز کا کھل جانا اور بات تھی۔ مگر اس کی شکست کی بات کا کھل جانا؟

”ارے ایلی تو یہاں؟“ کسی کی آواز سنائی دی  
گھبرا کر اس نے سراٹھا یا۔ سامنے صدر بارو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں  
میں وہی رم جھنم کا عالم تھا اور ہونٹوں پر طز تھا۔

”گھبراو نہیں،“ وہ بولا ”میں ہوں لیکن تم نے کبھی ہمیں جانا بھی ہو، سمجھا بھی ہو۔  
تمہاری آواز تو اکثر سن لیتے ہیں بھی لیکن مانا کبھی کبھار ہوتا ہے،“  
”جی جی،“ ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے

”میں آج کل پنج بیٹھے میں ہوتا ہوں نا“ صدر بولا ”اس کے چوبارے کے عین  
نیچے تمہاری آوازیں آتی رہتی ہیں ہم تو بھی آوازوں کے سہارے جی رہے ہیں۔“  
اس کی آواز میں مایوسی اور حسرت محسوس کر کے ایلی اور بھی گھبرا یا۔

”مل لیا کرو ایلی، وہ بولا“ بھی ہم سے بھی مل لیا گرو۔ مانا کہ آج کل اوپر  
فضاؤں میں اڑاتے ہوئے اس کی آوازنماک ہو گئی ”خدا کی قسم مجھے خوشی ہوتی ہے اس  
بات پر مگر ہم سے اتنا اجتناب بھی ٹھیک نہیں آیا کرو گے نا“ یہ کہہ کرو وہ بازو ہلاتا ہوا  
یوں دکان سے باہر کل گیا جیسے شیخ پر اپنا پارٹ ادا کر کے جاریا ہو۔  
بھی ایلی ہمچلتے نہیں تھا کہ رضا لاٹھی میکتا ہوا آکچھا۔ ”بیٹھے ہو“ وہ باہر سے چلایا۔  
آج تو ہم پر کرم ہو دیا ہے یا اس نے ماں کر کڑتے نہال دیا ہے۔ آخر کب تک  
خاکسار سے بات چھپاؤ گئے اورے والی سے پیٹ چھپانا اس میار کے دام میں پھنسے  
ہو پیٹا جس کا کان پانی نہیں مانگتا۔“

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ان دونوں اسے یہ معلوم نہ تھا کہ راز کو  
محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اہمیت نہ دی جائے جھٹلایا نہ جائے وہ تو  
سمجھتا تھا کہ راز کو محفوظ کرنے کے لیے شک کرنے والے کے روپ و قسمیں کھانا  
ضروری ہوتا ہے اس لیے اس نے قسمیں کھانا شروع کر دیا۔

”ایماں سے ایسی تو کوئی بات نہیں تم سے کیا چھپانا ہے“ وہ کھیانی پسی ہنسنے لگا  
”اچھا تو یہ بات ہے“ رضا نے لنگڑی ناگ جھلا کر کہا ”پیار چاہے کتنا ہی رنگ  
روغن کیوں نہ ہواندھیرے میں سب میالی و کھالی دیتی ہیں اور سب سے پسینے کی بو  
آتی ہے۔“

”بکونہیں“ ایلی نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

”جو جی چاہے کہو پر بات سوچنے کی ہے پلے باندھ لو کیا یاد کرو گے کہ رضا نے نئے  
 بتایا تھا پر یار کسی اور چھوکری سے لگاتے تو ہم بھی ساتھ دیتے تم کہتے تو سالی کو اٹھا کر

لے آتے یہ کیا گڑ بڑا دل دی تم نے ہماری پرواز اتنی اوپری نہیں اور پھر بعد میں نہ حاصل نہ حصول وہ تو بڑوں بڑوں کے کان کترتی ہے تو پہا ایک قیامت ہے سمجھی ہوئی۔“  
اس نے کہا ”بڑا اوپرچاہا تھا مارہے میرے یار نے۔“

ایلی خاموش ہو گیا رضا کے سامنے قسمیں لکھانا بے کار تھا۔ بالکل بے کار، رضا کے پاس وہ دو ایک گھنے بیٹھا وہ بھی بادل نا خواستہ، پھر وہ واپس گھرا گیا۔ کئی ایک مرتبہ اسے خیال آیا کہ رضا سے ساری بات کہہ دے لیکن شہزادی عزت کا سوال تھا۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو وہ رضا سے دل کی بات کہہ سکتا تھا یا اگر اس کا مقصد محض تفریح ہوتا تو بھی تھا۔ محبت کی بات کرنا تو اس قدر دشوار نہ تھا لیکن وہ اس خفت کا تذکرہ کیسے کر سکتا تھا جس کی وجہ سے ایلی تباہ حال محسوس کر رہا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنابری ایلی نے رضا سے بات نہ کی۔ اس کے باوجود اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضا سے ساری بات کہہ دے اور ول کارا ز کہہ کر اس گھنٹن سے نجات حاصل کرے جس کی وجہ سے وہ مضطرب تھا۔ جو اس کے بند بند میں رپی ہوئی تھی۔ وہ راز اس کے دل میں پھوڑ بن چکا تھا۔

اس کیمکش سے مخلصی پانے کے لیے وہ اٹھ چیٹھا ”میں اب جاتا ہوں“  
”ہاں بھائی“ رضا نے مسکرا کر کہا ”اب تو میرے پاس کیوں بیٹھنے لگا“  
”رضا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو“ ایلی نے منت سے کہا ”تیرے منہ سے ایسی بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

”میرے منہ سے تجھے کوئی بات اب اچھی لگے گی کیا“ رضا نے بناؤٹی سنجیدگی سے کہا

”پھر وہی بات“ ایلی چلایا ”تم سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اچھا میں جاتا ہوں“ یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔

”جانے کے لیے بہانہ مل گیا نا“ رضا نے چل کر کہا لیکن ایلی نے اس کی بات کی

کچھ پروانہ کی۔

## ماں اور بیٹا

بڑی ڈیوڑھی میں ارجمند کو دیکھ کر وہ خوشی سے چلایا ”ارے تم کب آئے؟“  
لیکن ارجمند کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہوا تھا گال پچکے ہوئے  
تھے چہرے پر مردی کی چھاتی ہوئی تھی۔

ایلی کی آواز سن کر ارجمند نے شور مچانے کی کوشش کی ”ماں کیا سمجھا ہے تم نے“  
لیکن کھانی کی وجہ سے وہ پوری بات نہ لرسکا۔

چھاتی لرز رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا ”کیا بت  
ہے؟“ اس نے سمجھی گئی سے پوچھا ”تم بیمار تو نہیں ہو؟“  
ارجمند کی آنکھیں پر نہ تھیں۔ اس نے مسکرانے کی شدید کوشش کی ”اپن کھانی  
وانسی کی پروانگیں کرتے“ وہ بولا ”کھانی کا کیا ہے اور یہاری نہ بھی اس خاکسار کو  
لگ بھی جائے تو سالی کو حاصل کیا ہو گا وہ بیار“

لیکن ایلی نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”تمہاری یہ حالت کیا ہو رہی ہے“  
”ہاں بھی یہ تو ہے“ ارجمند بولا ”وہ کہا ہے نہ استاد نے ہمارے ملٹخ کہتا ہے۔  
فراق یار میں گل گل کے بن گئے تھی۔ استاد کی بات عین صادق آتی ہے اپن پر پر  
تم فکر نہ کرو ایلی۔ چاہے وق کیوں نہ ہو جائے مرنے کے ہم بھی نہیں ہمارا مرننا کچھ  
ایسا آسان بھی نہیں کہو کپ کیپ کیا حال ہے روپورٹ دو۔ ساری کیس ہشری سنیں  
گے اپن تو کس حال میں ہیں یار ان وطن مثلاً“ اس نے اشارہ کیا لیکن کھانی کا دورہ  
پھر شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا رہا لیکن دورے کی شدت کی وجہ  
سے اسے بیٹھنا پڑا جب دورہ ختم ہوا تو ارجمند نے ایک بار پھر مسکرانے کی شدید  
کوشش کی۔ ”

یہ کھانی بھی اپن سے مذاق کرتی ہے۔ اپنا سارا کھیل فارت کر کے رکھ دیا سالی

نے ادھر ہم نے پرم سندھیں سے لڑکی پر جادو کیا اور اس کمخت نے سر نکالا۔ اپنا جادو ٹونے کا کھیل مکمل کریں یا بیٹھ کر کھانیں سب ملیا میٹ کر دیا۔ اپنے گاؤں میں ایک الیٰ میار آئی ہے اورے رے کیا بتاؤں کیا چیز ہے۔ مجھ لوگھی کی ملکی ہے اور گھنی بھی وہ جیسے کچھ گری ہو۔ کچھ گری کیا چھین ہے کیا باتاں ہے۔ اور پھر چال یوں چلتی ہے جیسے ناگ رانی ہو۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے وہی چمگ اہر انے لگی چہرے پر وہی انبساط دہنے لگی۔

دفعتاً گلی سے ارجمندگی ماں نے سر نکالا جیسے وہ وہاں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ ماں کو دیکھ کر ارجمند تھے پہنچتا ابدالا ”ارجنتے یا ہو“ وہ بولा ”سنا نہیں گے کسی وقت تمہیں یہ قصہ ارے بھی وہاں آؤ تو مکھا میں میں میں شارے کا دل کو مریدہ بنار کھا ہے۔ تمہارے اس خاکسار نے سام جپتے ہیں لوگ ”پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا“ ”ماں تو کیوں یہاں کھڑی ہے۔ کوئی کام ہے تو حکم کر کسی سے ملتا ہے تو میں ڈھونڈ کر لے آؤں“

”میں تو تجھے دیکھ رہی تھی“ ماں نے کہا اس کی آواز بھرا تی ہوئی تھی آنکھیں پنم تھیں۔

”مجھے دیکھ رہی تھی کیوں میرے لاٹ کیا حکم ہے ماں“ وہ چلانے لگا ”کام تو کوئی نہیں“ وہ بولی ”ویسے ہی دیکھ رہی تھی تجھے“

”اچھا تو صرف دیکھنا ہے تو دیکھ لو دیکھ لو ادھر سے اور ادھر سے بھی“ اس نے اپنا چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔

ماں نہ پڑی ”تو تو مزاح کر رہا ہے“ وہ بولی ”چل اب گھر چل آرام سے لیٹ تیری طبیعت اچھی نہیں“ ”لو ماں“ وہ ہنسنے لگا ”ہٹا کٹا تو ہوں دیکھ تو میری طرف“ یہ کہتے ہوئے ارجمند کو پھر کھانی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نیا سے روکنے کی شدید کوشش کی لیکن بے سود وہ بے بس ہو کر دیوار کا سہارا لے کر کھانے لگا اس کی حالت دیکھ کر ماں

کی آنکھوں سے ٹپٹپ آنسو گرنے لگے۔

”کسی کا دوش نہیں“ وہ بولی ”میرے نصیب؟“ اس نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا۔

”میرے نصیب وہ اس سے بڑا لڑکا تھا“ اس نے ایلی سے مخاطب ہو کر کہا ”کیسی بھر پور جوانی آتی تھی اس پر بیٹے آنکھ نہیں تھی تھی۔ اور قدیوں نکلا تھا جیسے سرسوں کا بونا نکلتا ہے بس نظر کھائی اسے۔ کہتے تھے دق ہو گیا ہے۔ انہوں دق نہیں اسے تو نظر کھائی۔ اور اب یہ اس نے ارجمند کی طرف اشارہ کی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پوم غصے گئی۔

ارجمند کو دورہ ختم ہوا تو اس نے بڑھ کر ماں کو آغوش میں لے لیا ”اوہ ہوں ماں مجھے نظر نہیں لے گی۔ میں تو نظر بٹو ہوں۔ اور وقق میں تو سینکڑوں دق ہضم کر جاؤں۔ اپن مرنے والے نہیں۔ موت کی کے مجال ہے جواہر ہماری اور آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ تم تو ویسی ہی جی برآ کر رہی ہوا پنا“ ارجمند نے یہ کہہ کر ماں کو آغوش میں اٹھایا اور ایلی سے بولا ”ملو گے ناشام کو بابا ہر سیر کرنے چلیں گے“ اور خود گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کی ماں چیخ رہی تھی ”اب مجھے چھوڑ دے چھوڑ بھی دے“ اور وہ بنتے جا رہا تھا۔ ”کیسے چھوڑوں بڑی مشکل سے قابو میں آئی ہے تو“

### یہ دن وہ دن

ارجمند کے جانے کے بعد ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ محلہ ایک ویرانہ ہو۔ ایک بھی انک ویرانہ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ گھر جانا تو اس کے لیے قطعی طور پر ناممکن ہو چکا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ کیا کہیں گی شہزاد تو خیراب ان کے ہاں کبھی نہ آئے گی۔ لیکن اس کا نہ آنا بھی توبذات خود ایک واضح اشارہ ہو گا۔ اور فرحت کو تو طعنے دینے کی عادت ہوئی۔ بڑی معصومیت سے کہے گی۔

”نه جانے اب شہزاد کیوں نہیں آتی ادھر۔ کیوں ایلی کیا بات ہے؟“ اور اس کے

امداز میں بلا کا تمسخر ہوگا۔ شہزادے کے گھر جانے کا سوال ہی پیدائشیں ہوتا تھا اس کی نگاہ میں کس قدر تحقیر ہوگی؟ ”اگئے تم بڑی مردانگی کا ذمہ لئے پھرتے تھے۔ میری بات ہی نہیں سنتے تھے۔ اتنی ملتیں کیس میں نے کہ نہ یہ خیال نکال دو اپنے دل سے لیکن سر پر بھوت سوار تھا، ایلی نے جھر جھری لی تو بہت ہے وہ بولا اور پھر سوچنے لگا ”کہاں جاؤں میں کیا کروں؟“

”ارے تم یہاں ایلی“ صدر کی آواز سن کر ایلی چونکا یہاں کیا کر رہے ہو تم تمہیں باہر نکلنے کی فرصت مل گئی لیکن یہاں سے نہیں پینٹر اپلا“ بڑے خوش نصیب ہوتا، خدا کی تسمیہں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ صرف یہ انتباہ ہے کہ کبھی ہمیں بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے تھیں نہیں معلوم ایلی، صدر اپنے مخصوص امداز میں یوں کہنے لگا جیسے شیخ پر ڈرامہ ٹھیک رہا ہو۔ زندگی میں مجھے بھی بڑے بڑے موقعے ملے ہیں۔ ایسے موقعے کہ لوگ میری طرف دیکھا کرتے تھے۔ سراخا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے جیسے آج میں تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں لیکن ان دونوں ہم ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک عجیب شان تھی اپنی کسی کی آنکھ کا تارا بننے میں عجیب شان ہوتی ہے اور پھر اس کی آنکھ کا تارا جو خود زمانے بھر کی آنکھ کا تارا ہو، جسے دنیا آنکھوں پر بٹھائے، اس کی آنکھوں کا تارا تم جانتے ہی ہو لیکن اس زمانے میں مجھے یہ معلوم نہ تھا کبھی آنکھ سے گر کر دنیا کے پاؤں میں روندا جاؤ۔ سو آج ہم تو پاؤں میں روندے جانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ تم بھی روندو“ لیکن بھائی ہر کسی کو ”صدر آہ بھر کر بولا“ وہ دن بھی میر آتے ہیں اور یہ دن بھی دیکھنے پڑتے ہیں، اس نے پر معنی امداز سے کہا پھر دفعتاً چونک کر بولا“ یہاں کیوں کھڑے ہو۔ انتظار کر رہے ہو کیا فرصة ملے تو آ جانا کبھی میرے پاس اسی چوبارے کے قدموں میں پڑا رہتا ہوں،“ یہ کہہ کر وہ یوں چل پڑا جیسے مکالمہ دا کر کے شیخ سے جا رہا ہو۔

صدر کے جانے کے بعد دنیا ایلی کی نگاہ میں اور بھی تاریک ہو گئی۔

وہ چپ چاپ محلے سے باہر نکل گیا اور شہر کی فصیل سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کس مقصد کے لئے جا رہا ہے۔ اسے صرف ایک دھن تھی کہ شہزادے دواراں محلے سے دور کہیں جنگل میں چلا جائے لیکن وہاں جا کر کیا کرے یہ اسے معلوم نہ تھا۔

کوٹلی پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور کنکراٹھا کرتا لاب میں چھینکنے لگا۔ ویریک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ سامنے داخل گے اور آسمان پر شفق کی سرخ دھاریاں دوڑ گئیں۔ پھر بھی اس میں گھر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ گلی کی عورتیں اسے دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اس سے پوچھیں گی ”ہے الیں آج تو سارا دن باہر کیسے رہا؟“

### کاش کہ

پھر جب شفق کی شلنگی دھاریاں سیاہی مائل ہو گئیں تو وہ اٹھا اور محلے کی طرف چل پڑا۔

چھتی گلی کے پاس جا کر وہ پھر رک گیا۔ شاید وہ چھتی گلی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن چھتی گلی ویران پڑی تھی۔ شہزادے کے مکان کی پھلی منزل میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رک کر سننے لگا۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ کہیں وہ باہر نہ نکل آئیں اس خیال پر وہ ڈر کر بھاگا۔

اندھیرے ڈیوڑھی میں وہ دھم سے کسی چیز سے ٹکرایا۔

”ہائے،“ کسی نے چیخ سی ماری

اس کا دل ڈوب گیا

”کون ہے کون؟“ اس نے چلا کر کہا مگر اس اندھیری ڈیوڑھی پر خاموشی طاری رہی۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی دھندلی شکل اس کے قریب ہی کھڑی ہو۔

”کون ہے کون ہے؟“ وہ پھر چلایا اس نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے ہاتھ چلایا۔ نرم و گرم لمب سے گھبرا کر اس نے وہ لگتی ہوئی چیز تھام لی۔ اس کے سامنے

شہزادی کی ڈولتی ہوئی کشتنی نہما آنکھیں ابھر آئیں۔

”اوہ“ اس نے گھبرا کر شہزاد کا بازو چھوڑ دیا۔ اور بھاگنے لگا

”ایلی،“ شہزاد کی آواز میں منت تھی ”ایلی افسوس ہے تم پر“ اس نے اس کا کوت پکڑ لیا وہ رٹپ کر مرزا اور سمجھے سوچے بغیر وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگا ”میں نے جنم لیا ہے شہزاد میں نے چاند پر وہ بات پوری نہ کر سکا شہزاد خاموشی سے بت بنی کھڑی رہی“ میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد نہیں ہوں۔ کاش کہ میں تم سے بھی نہ ملتا۔ میری نگاہ تم پر بھی نہ پڑتی۔ سمجھے زمین جگہ دے دیتی اور میں اس میں سما جاتا۔

”ایلی،“ وہ چلانی ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“

لیکن ایلی اس کی بات نے بغیر بچے کی طرح روتا اور چلاتا رہا ”شہزاد تم اپنے دل میں کیا کہتی وہ گی۔ تم کیا سمجھتی ہو گی کاش میں اس قابل ہوتا کہ تمہیں اپنی بنا سکتا۔ میں نے تمہیں اپنی ملکہ بنایا تھا۔ میں نے تمہیں اپنی دیوی بنایا تھا مگر میں تمہاری پوچا نہ کر سکا۔ میرے پاس ہے ہی کیا جو تمہیں ملکہ بناؤں۔ سمجھے معاف کرو شہزاد شہزاد“

”ایلی،“ وہ مسکراتی اس کی آنکھیں گویا جھیلوں میں تیر رہی تھیں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

”نہیں نہیں“ وہ چلانے لگا ”میں میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میرے غایظ ہاتھ تمہارے پا کیزہ جسم کو چھوٹے کے قابل نہیں“ ایلی نے شہزاد کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے وجود سے تمہاری زندگی کو ویران نہیں کروں گا۔ صرف ایک بار، ایک بار سمجھے معاف کر دو۔ میری حماقت کو معاف کر دو ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا پھر میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ چپ چاپ اور چاہے میری زندگی تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے میں کبھی بھول کر بھی“

”ایلی،“ وہ چلانی ”تم نے سمجھے کیا سمجھا ہے“

”غبیس نہیں“ وہ ازسرنو ملتیں کرنے لگا ”مجھ سے غلطی ہوئی میں تسلیم کرتا ہوں“  
”یہ تم کیا کہہ رہے ہو“ وہ بولی ”ایلی میری طرف دیکھو“ اس کی آنکھوں میں آنسو  
تیر رہے تھے۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو کس قسم کی خورت سمجھتے ہو مجھے کیا میں؟“

”غبیس نہیں مجھ سے غلطی ہوئی“ وہ ازسرنو گھبرا گیا۔

شہزادے بڑھ کر اس کے بازو پلڑ لیے ”تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔  
مجھے خواہش“ وہ رُک گئی اس کی آنکھوں سے آنسو آگرا۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ کیوں رورہی  
تھی۔ کیوں رورہی تھی وہ نہ سمجھ سکتا۔ ”کاش تم اس قسم کی غلطی نہ کرتے“ وہ بولی ”کاش تم میرے لیے صرف ایلی ہی  
رہتے پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھے صرف تم پیارے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں“ وہ  
پھر رونے لگی۔

اگرچہ ایلی نے کبھی اس بات کو واضح طور پر تسلیم نہ کیا تھا کہ اسے شہزادے کے جسم کی  
ہوں تھی۔ اگرچہ وہ اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر یہ تاثر اس قسم کا نہ تھا  
جسے عشق کہا جاسکتا۔ خوبصورت حورتیں تو اس نے کئی ایک دیکھی تھیں لیکن اسے ان  
سے عشق پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ تاثر عملی طور پر اس حد تک صرف اس لیے بڑھ گیا تھا کیونکہ  
اسے شہزادہ کا قرب حاصل تھا کیونکہ اسے شہزادے کے قریب رہنے کے موقع حاصل  
تھے۔ شاید دل ہی دل میں سوچا ہو کہ وہ شہزادے سے تفریح کے چند لمحات حاصل کر سکتا  
تھا کیونکہ ایک تو شہزاد محلے والیوں کی طرح پتھر دل نہ تھی۔ اور اس لیے اس سے دل  
کی بات کہی جا سکتی تھی اور دوسرے چونکہ وہ محلے کے تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا  
مرکز تھی شاید اس کا خیال ہو کہ شہزاد اس کی جرأت اور جسارت کا براہمانے مانے گی۔

”کاش کہ تم مجھے سمجھ سکتے“ شہزادے بمشکل کہا ”کاش کہ تم جانتے“ یہ کہہ کرو وہ  
چل پڑی اور وہ چپ چاپ حیران وہیں کھڑا رہا۔

دیریک وہ وہ ہیں کھڑا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ شاید اس کا خیال تھا جب وہ شہزادے سے معافی مانگے گا تو شہزادے سے تھپک کر کہے گی اب تو معاف کرتی ہوں مگر آئندہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔  
مگر شہزادے کے برتاب و سے تو ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی بات پر دکھ محسوس کر رہی ہو۔

کچھ دیریک تو وہ وہاں اس اعتبار پر کھڑا رہا کہ وہ دونوں اس اندر ڈیورٹی ڈیوڑھی میں بچوں کی طرح آنکھ مچوں کھیل رہے تھے اس کا خیال تھا کہ شہزادے وہ ہیں کہیں چھپی کھڑی ہے اور چوری چوری اسے دیکھ رہی ہے۔ اس صورت میں تو اسے فوراً جانا نہیں چاہئے آخر وہ کیا مجھے کی کہا میں کا جذبہ اس قدر کمزور ہے کہ گرنے کے بعد فوراً ہی سنجل جاتا ہے۔ اس میں اور کوئی خوبی نہیں ایں ایک محبت ہی تھی ناصرف محبت اس لیے اس کے محبت کے جذبے میں اس قدر کمزوری نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اندر ڈیورٹی ڈیوڑھی میں اندر ہیرے کے سوا کچھ نہیں اور اندر ہیرا بھی وہ جس میں نہ جانے کیسے کیسے کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے اس خیال کے آتے ہی وہ گھبرا گیا اور آخری مرتبہ ڈیوڑھی کا جائزہ لے کر میڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر جا کر دیریک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ کیا واقعی شہزادو کو اس سے شکایت تھی۔ مگر اس کے انداز میں غصے کی نسبت وہ کی جھلک تھی۔ اس نے اسے دکھنے نہیں پہنچایا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے، وہ روکیوں رہی تھی کیا وہ ایلی کی خفت پر رورہی تھی مگر ایلی کی خفت پر اسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ اس لیے رورہی تھی کہ ایلی سے اسے وہ بات میسر نہ ہو سکتی تھی۔

در اصل شہزادے کے متعلق ایلی کے خیالات اور جذبات متفاوت ہم کے تھے ایک طرف تو وہ اسے ایک بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا ایسی ہستی جو اس قابل تھی کہ اسے دیوی بنا کر پوچا جائے۔ دوسری طرف وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک مشاق کھلاڑی تھی ورنہ وہ کبھی اس

رات اس کا ہاتھ تھا منے کی جرأت نہ کرتا اگرچہ اس خیال کو اس نے شوری طور پر کبھی نہ اپنایا تھا وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد کا تبعیم دیکھنے والے کو شہدینے کی غرض سے ہونٹوں پر آتا ہے اس کی چال اس کا ہر انداز اس کی گفتار اس کی ہر چھوٹی جنبش دعوت تھی، صدائے حام تھی۔ اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ شہزاد کی ایسی ایسی لغزش پر دکھ محسوس کر سکتی ہے۔ اس کا اول حصہ ثبوت یہ تھا کہ محلے کے تمام نوجوان شہزاد کے گرد پروانوں کی طرح گھوما کرتے تھے اور وہ ہر ایک سے نہیں نہ کر بابت گرنے کی عادی تھی۔ رفیق ریشمیں رومال پہلاتا ہوا اور جھکلتا ہوا پوچھا، ”میں نے کہا پوچھ جاؤ اُس شاید کوئی سودا منگوانا ہو میں نے کہا پوچھ جاؤ“

”ہوں تو آگئے تم میں بھی کہتی تھی، میں نے کہا پوچھ جاؤ“ صبح سے نہیں آیا۔ اچھا تو، ”میں نے کہا پوچھ جاؤ“ ذرا بیٹھ جاؤ، پھر وہ اپنی سیاہ آنکھیں گھما گھما کر اس کی طرف دیکھتی اور مسکراتی۔ اس وقت ایلی محسوس کرتا جیسے اس کے پوچھنے کی عادت پر مذاق اڑا رہی ہو۔ اور اسے تلقین کر رہی ہو کہ پوچھنے کی عادت چھوڑ دے اور بنا پوچھنے کی جرأت پیدا کرے۔

یا جب کبھی صدر اس کی نظر پڑ جاتا تو وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر چلاتی ”میں نے کہا کس خیال میں کھڑا ہے تو وہ پار سن نہیں بھولی ابھی تک لیکن میں کہتی ہوں اب آہیں بھرنے سے کیا حاصل جب موقع تھاتب کھو دیانا“

جب شہزاد اس قسم کی بے تکلف باتیں کرتی تو ایلی محسوس کرتا جیسے وہ لوگوں کو اس کا رہی ہو متوجہ کر رہی ہو۔ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ ایک کھلاڑی ہے۔ لیکن جب وہ پر نم آنکھوں سے ایلی کی طرف دیکھتی اور کہتی ”ہے ایلی یہ تم کیا کہہ رہے ہو تم نے مجھے کیا سمجھتا ہے“ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ اس کی بظاہر شو خی محض ایک دکھلاوا ہے اور وہ حقیقت وہ ایک غظیم شخصیت کی مالکہ ہے۔

شہزاد کے دل کی گہرائیوں کو محسوس کر کے ایلی اس سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت

جس میں دیوانگی کا عنصر تھا۔ اس وقت ایلی کی نگاہ میں شہزادو یوی کا روپ دھار لیتی تھی وہ پچاری بن کر اس کے قدموں میں گرجاتا۔

لیکن جب شہزاد میں شوخی کا عنصر بیدار ہوتا اور وہ دوسروں سے چمک کر بات کرتی تو ایلی آتش رقابت میں جلتا اس کا دل یوں ملگئے لگتا جیسے کسی نے بھس میں آگ لگ دی ہو۔ اور شہزاد اس کی نگاہ میں قلوپڑہ کی حیثیت اختیار کر لیتی اور وہ سمجھتا کہ شہزاد کو اس سے کوئی لگائی نہیں وہ صرف اس سے کھیل رہی ہے جیسوہ اک سکھونا ہو۔ وقتی تفریح کا سامان۔

اس روز اندر حیری گلی میں شہزاد کا رہتا وہ لیکھ کر ایلی کو بے حد تعجب ہوا آخر وہ ایلی کے رویے پر اس قدر پریشان ہیوں تھیں اسے وہ یوں ہو رہا تھا۔ ایلی کے خیال کے مطابق اول تو اسے فرحت کے گھر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور اگر آتی بھی تو اس کے انداز میں تمسخر اور تحریر کا عنصر ہونا چاہئے تھا۔

ایلی گھر پہنچا تو فرحت نے اسے دیکھ کر کہا ”تو کہاں رہا آج سارا دن ایلی شہزاد سارا دن تجھے تلاش کرتی رہی آج تو بہے ہے صح سے اب تک میسیوں مرتبہ آئی ہو گی ادھر“

”کہاں چلا گیا تھا تو“، باجرہ ولی زبان سے بولی ”میں تو ڈر گئی کیوں خیر تو ہے“، اس نے پوچھا ”بولتا کیوں نہیں“

”ویسے ہی باہر چلا گیا تھا“، ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی ”تو تو کبھی نہیں نکلا باہر“، فرحت نے کہا ”ہر وقت وہیں گھسارتا ہے شہزاد کے پاس“

”اے ہے کیا کہہ رہی ہے تو“، باجرہ نے فرحت کو لوکا ”چاہے کہیں رہ پیٹا لیکن یوں گھر سے باہر نکل جانا بتائے بغیر تیری تو عادت ایسی تو نہیں“، ”لڑائی تو نہیں ہو گئی تمہاری آپس میں“، فرحت بولی ”بیچاری صح سے سرگردان پھر

رہی تھی”

”چاچا کرامے مل آئے معلوم ہو کتو آگیا ہے“ ہاجرہ نے کہا

”ناس وقت میں تھکا ہوا ہوں“ ایلی نے کہا ”میں نہیں جاؤں گا“

”اے ہے وہ بیچاری“ ہاجرہ نے اس کی منت کی

”چھوڑ بھی ماں“ فرحت بات کاٹ کر بولی ”زیر دست کیوں کرتی ہو۔ اس کا جی نہیں چاہتا تو نہ سبی خواہ مخواہ ایسا بھی کیا ہے صحیح ہو آئے گا“

رات کو دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا ”نہیں نہیں وہ مجھے بھی اچھا نہیں سمجھ سکتی۔ اور محبت محبت اس براہتے پر کی جاتی ہے زبانی دعوے کو ان خاطر میں لاتا ہے۔ بے کار کی باتیں، اس وقت رات کے اندر ہیرے میں دو رنگیں بازو اس کی طرف ہلاتے“ ایلی، قریب سے آواز آتی ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے“ ایلی کو پسینہ آ جاتا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ وہ پھر سے سوچنے لگا ”آخر وہ عورت ہے اور عورت کو صرف مرد سے محبت ہو سکتی ہے۔ مرد سے“ پھر وہ ذوقی ہوئی پر نہم آنکھیں اس کی طرف تمسخر بھری نگاہوں سے دیکھتیں ”ایلی تم مجھے کیا سمجھتے ہو کیا سمجھا ہے تم نے مجھے“ نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا سوچتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

### جادو کا کھیل

صحیح سوریے ناشتہ کیے بغیر وہ چپکے سے باہر نکل گیا تاکہ ہاجرہ یا فرحت اسے کچھ کہہ نہ سکیں۔ وہ سیدھا ارجمند کے ہاں پہنچا

”اے تم اتنی سوریے“ ارجمند اسے دیکھ کر چلا یا ”کہیں تم نمازی تو نہیں بن گئے اپنے اپدیش کا اتنا اڑ تو نہیں ہو گیا۔ آؤ آؤ اماں رک کیوں گئے“ بیٹھ جاؤ آج وہ چیز دکھائیں گے تمہیں کہ قسم ہے عمر بھرنے دیکھی ہو کبھی۔ کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست تھا اپنا۔ یہ کھڑکی کھولنا ذرا یہ جو سر ہانے کی طرف ہے۔

”اے رے رے“ وہ چلا یا ”تم نے تو بالکل ہی کھول دی“ اس نے ہاتھ پڑھا کر

کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا ”اماں کوئی ہوا تھوڑی کھانی ہے کہ پٹ کھول دیں۔ اپنے تو محض دیوی کے درشن کرنے ہیں اور چوپٹ کھلی ہو تو دیویاں چونکی ہو جاتی ہیں اور پھر درشن میں وہ بات نہیں رہتی۔ یہ اتنی درز کافی ہے اب دیکھو۔ اونہوں گھبراو نہیں“ ارجمند بولا۔ ”مال ادھر نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی ہے اور باتی سب سورج ہے ہیں بے تکلف دیکھو۔ سامنے چو بارے میں ساری ہکوریاں اور ڈکورے باری باری جائیں گے اور پھر جائتے ہی ہر کوئی پہلا آئینے کے سامنے آ کھڑی ہو گی یہاں کی ریت ہے۔ جائتے ہی پہلا آئینے میں اپنا آپ دیکھتی ہیں کہ جو کن رات کو چوری تو نہیں کر لیا کسی نے آئندھیں میں گی انگرزاں یاں یہیں گی آہا ہا۔“ وہ چلایا ”عورت کو دیکھنا ہلوں صحیح صوری ہے دیکھو آہا ہا ہا“ کیا جو کن ہوتا ہے۔ جب وہ سو کر اٹھتی ہے آنکھوں میں خمار بال اچھے ہوئے جسم گدرا یا ہوا۔ اور پھر انگرزاں یاں وہ کہا ہے نا استاد نے ہاتھ انگرزاں کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی۔ آہا کیا کیا کیفیت ہوئی ہے واہ واہ واہ ارے ارجمند چلایا ” وہ گئی ارے دیکھ بھی میرے منہ کی طرف کیا دیکھتا ہے یا ریہاں تو کچھ نہیں وہ تو ادھر ہے سامنے چو بارے میں آہا۔ کیا چال ہے کیا انداز ہے میری جان میں تجھ پر قربان بولو وہ انگرزاں شروع ہوئی واہ واہ واہ کیا انگرزاں لینے کا سلیقہ آتا ہے ان کو جسم کی بوئی بوئی تحرک جاتی ہے سجان اللہ“

اور وہ دیر تک کھڑکی کی درز سے مقابل کے چو بارے کی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ سورج چڑھا آیا گھر کے سب لوگ بیدار ہو گئے۔ لیکن ارجمندان باتوں میں بہت تاک تھا۔ وہ کب آڑے آنے والا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چلا کر کہنے لگا ” ماں ادھر کوئی نہ آئے میں ایلی کو جادو کا کھیل دکھانے لگا ہوں“ پھر وہ دبی آواز میں بولا ” ابے دیکھ بے جادو کا کھیل واہ واہ کیا جادو گرنی ہے موی کو پا گل نہ بنادے تو اپنا ذمہ“ اور پھر با آواز بلند کہنے لگا ” دیکھو بھی ایلی یہاں آتہ ہے اٹھ اعام مرضی کا اٹھ اس میں نہ تو بجلی لگی ہے اور نہ اس کے

اندر کوئی گیس چھپا ہے اب میں اس کو روشن کرتا ہوں۔ انڈا یوں چمکنے لگے گا جیسے  
اندھیرے میں جگنو چمکتا ہے ہے ہے ”پھر وہ زیر لب چلا یا“ اُرے ادھر دیکھنا آہا ہا  
ہا کیا جگنو چمک رہے ہیں اندھیرے میں۔“

### مرالیا بابا جی رے

”چاچی“ نیچے سے شہزادی آواز ن کرایلی کا دل ڈوب گیا“ میں نے کہا چاچی کھر  
پڑی ہے نا تو“ وہ پھر چلانی  
وہی ہے ایلی کے دل میں کسی نے کہا۔ شہزادی آواز محلے بھر سے الگ تھی اس میں  
ایک بار لوچ تھا ایک شوشی تھی۔  
”اُرے“ اُر جمند چلا یا“ مرالیا کہاں باہی رے  
باہر ارجمند کی ماں کہہ رہی تھی ”تو شہزاد تو ادھر کیسے آنکھیں کہیں راستہ تو نہیں بھول  
گئی۔ شکر ہے تو میرے گھر آئی۔ ہے کتنی خوشی ہوئی ہے مجھے“  
”ویسے ہی جا رہی تھی ادھر غنور کی طرف تو میں نے کہا چاچی کو دیکھا آؤں۔ نہ ہے  
اُر جمند آیا ہوا ہے۔“

”رام رام رام رام“ اُر جمند بولا“ دیوی کے منہ پر داس کا نام آیا۔ اُرے بے  
وقوف بھاگ کر دروازے کی کنڈی کھل دے کیا معلوم نام جو اپنا لیا ہے تو شاید درش  
بھی ہو جائے اُرے دیکھا کیا ہے“ ایلی کو چپ بیٹھے دیکھ کر ارجمند نے چھانگ لگائی  
اور دروازہ کھول کر پھر بستر کی طرف لپکا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی ”یہ مٹی کے دیئے  
جھاڑ فانوس کے رو برو کیا حیثیت رکھتے ہیں“

ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا وہ جانتا تھا کہ شہزاد اس کے لیے وہاں آئی ہے۔ لیکن اسے  
یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے لئے شہزاد اتنی دور چل کر ارجمند کے گھر آئے۔ جہاں  
پہلے وہ کبھی نہ آئی تھی۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ اس کشمکش میں کھویا ہوا تھا۔  
”اُرے او تجھے کیا ہو گیا ہے۔ زبان کیوں بند ہو گئی تیری۔ دیکھا نہیں باہر گوکل

کے کنهیا آئے ہیں واہ واہ اس کنهیا کی ہر بات نیاری ہے۔ بولتے میں جیسے تان اڑی

ہو، چلتے میں جیسے راس رچائی ہو اور بات ہے ہے کیا بات کرتے ہیں۔“

شہزاد کو دروازے میں کھڑی دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اور گویا بھیڑ کی کھال اتار

کر بھیڑ کے روپ میں آ گیا ”سلام کہتا ہوں“ وہ ادب سے بولا

”کب آیا تو، شہزاد نے ایلی پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا

”چار روز کی چھٹی پر آیا ہوں جی“ وہ بولا

”تو یہاں بے ایلی“ وہ ایلی کے قریب آ کھڑی ہوئی ”اور وہاں کھر میں تیری تلاش

ہو رہی ہے میں نے تو کہا تھا ڈھنڈو را پیٹوادو یعنی غمیں ملے گا“

شہزاد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خوبصورکاریا آیا اور ایلی اسے محسوس کر کے

مدھوش ہو گیا۔ نہ جانے شہزاد سے وہ خصوصی خوبصوریوں والستی تھی۔ حالانکہ اس نے

کبھی خوبصورت استعمال نہ کی تھی۔ اور وہ خوبصورتی عجیب سی تھی جیسے سحر کے وقت فضا سے

باس آتی ہے جسے نہ تو بو کہا جا سکتا ہے اور نہ خوبصورت۔

پھر دعطا شہزاد نے بڑھ کر ایلی کامنے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ”کیا ہے تجھے جواب

کیوں نہیں دیتا“ وہ بولی دبا ہوا آتش فشاں پھٹ گیا۔ ایلی کا سر ہوائی بن کر اڑ گیا۔

اور وہ خود لٹوکی طرح گھونمنے لگا اس نے جھپٹ کر شہزاد کے بازو پکڑ لیے۔ اور پھر مر

کر شہزاد کی طرف دیکھا اس کی ایلی ہوئی آنکھوں میں منت تھی، آہ وزاری تھی۔

شہزاد نے ایک رنگین قہقہہ لگایا ”اوہ“ وہ بولی ”یہاں تو حالات بہت بگڑے

ہوئے معلوم ہوتے ہیں“ اور وہ نہستی باہر نکل گئی۔

کمرے پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر بیٹھ رہیوں میں وہی چوکڑی بھرنے کی آواز سنائی دی چھن چھن کوئی

سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”اڑے رے رے“ ارجمند چلایا ”ہاہامندر میں گھنٹیاں بجیں دیوی آئی اور چل گئی

اور تو ابے او ہرامی تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ سالے تو انہوں نے۔ بد نصیب ہے، گدھا ہے قسم ہے اگر ایک بار وہ اپن کامنہ سہلا دے تو دنیا تیاگ کریو گی بن جاؤں۔ ارے دیوی سی دیوی ہے۔ اس کے رو برو سب بیچ ہیں۔ ایسا چاند ہے جو چمک کر سب تاروں کو ماند کر دیتا ہے۔ واد واد کیا پیغز ہے اور تو تو وہاں رہتا ہے اس کے پڑوس میں۔ اور وہ تیرے منہ کو ہاتھوں سے سہلاتی ہے۔ اور تجھ سے اشاروں میں باقیں کرتی ہے۔ اور پھر اتنی قریب رام رام رام ارے یا رہمیں دھوکے ہی میں رکھا آج تک۔“

”کیا فضول کیک رہا ہے تو؟“ ایلی نے چیخ کر رہا ”چھوڑ“ ارے کس طرح چھوڑوں بھنوڑا پھوڑ کو چھوڑ دے چکوڑ چاند کو چھوڑ دے پہاپن اپ جانیں چھوڑ سکتے۔ اور پھر دیوی بھی وہ جس کے چرنوں میں سکھ ہے شانتی ہے۔ گودنیمیں چرنوں میں۔ گودوالی دیویوں تو میسیوں پھرتی ہیں۔ ان کی بات اور ہے۔

شہزادو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہاجرہ آگئی۔“ ہے ایلی تو یہاں بیٹھا ہے اور ہم سب وہاں ڈھونڈ کر پا گل ہو رہے ہیں۔“ وہ چلانے لگی ”کسی کو بتا کر آیا ہوتا یہاں لوہم نے کوئی بندش لگا کر گئی ہے تیرے آنے جانے پر نہ کھایا نہ پیانہ کسی کو بتایا کہ میں ارجمند کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہن ناحق پر بیشان ہو رہی ہے وہ تو اللہ بھلا کرے شہزاد کا کہاں نے ڈھونڈ نکالا تھے۔“

”ارے“ ارجمند زیر لب بولا ”تو تجھے ڈھونڈ نے آئی تھی۔ اپن سمجھے اپنی کی تقدیر جاگ پڑی۔“

”اور دیکھو۔ ہن ویسے تو یہ اپنا ہی گھر ہے جس وقت چاہے آئے جائے لیکن۔ ہن بتا کر تو آتا“ پھر وہ کمرے میں آ داخل ہوئی۔ ”کیا کر رہا ہے تو چل اب گھر چل پھر آجائے گا تیرے پاس ارجمند۔“

”سلام عرض کرتا ہوں“ ارجمند اٹھ بیٹھا

جاتا۔

## مہادیو

جب وہ گھر پہنچا تو پھر شہزاد اس کے روپ و لکھی ہوئی ”ماں کے کہنے پر آ گیا تو اور جب میں کئی تھی اس وقت تو یوں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ جیسے جسم میں جان نہ ہو۔“

”اگیا ایلی،“ فرحت اندھے وکیج کر بھاگی آئی ”اے ہے چائے تو پی کر جاتا کب سے رکھی ہے اب تو تمہاری بھی ہو گئی“ میر ملکہوں یا پھر سے بنادوں“  
”مجھے بھوک نہیں،“ ایلی نے بے پرواہی سے کہا

”تو چائے ہی لے“ ہاجرہ بولی

”میرا جی نہیں چاہتا“ وہ روکھی آواز میں بولا

شہزاد نے بڑھ کر اس کی کلامی پکڑ لی۔ اور اسے سمجھنے ہوئے بولی ”چل جو تیرا جی چاہتا ہے وہ کھلاوں تجھے چل۔“

فرحت نے شرات بھری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا ”تم ہی جانو کیا جی چاہتا ہے اس کا اپنے بس کی بات تو نہیں“

”جبھی تو لیے جا رہی ہوں اے“ شہزاد نے نہ کہا ”تم بیچاری کیا جاؤ،“

”ہاں ہاں“ ہاجرہ بولی ”لے جا سے لے جا بس خوش رہے میں تو یہی چاہتی  
وہس۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی“

پہلے تو ایلی نے بازو چھڑانے کی خفیہ سی کوشش کی لیکن شہزاد سے بازو چھڑانا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر وہ اس کے پیچے پیچھے گیند کی طرح لڑھتا چل پڑا۔

”تو بہے“ وہ اکیلے میں کہنے لگی ”بڑے خرے آ گئے ہیں تجھے مانتا ہی نہیں کسی

صورت دو روز سے پاگل کر رکھا ہے مجھے“

”لے بیٹھ یہاں“ شہزاد نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اسی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا ”تو بہ ہے دو روز سے کیا حال کر دیا ہے۔ میری طرف دیکھ،“ اس نے ایلی کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا شہزاد کی آنکھوں میں آنسو تھے ”میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا ایلی،“ اس نے پوچھا

شہزاد کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایلی کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ وہ دھم سے اس کے پاؤں پر گر پڑا ”میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد،“ وہ بولا ”میں تمہارے قابل نہیں ہوں میں نااہل ہوں تھے ہوں تھے“ اس کی آنکھیں ابندھ گئی۔ شہزاد نے اس کا سر اپنے جسم سے لگایا اور تھکانے لگی۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھو۔ جو حالت میری ہوئی ہے تمہارے بغیر میں ہی جانتی ہوں“

”میں کچھ کھا کر مر جاؤں گا۔ زندگی بے کار ہے اب،“ ایلی نے کہا ”چپ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم مر جاؤ گے تو میرا کیا ہو گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے ایلی مجھے تمہاری لگن ہے صرف تمہاری تم سے کچھ نہیں چاہئے۔ لب تم میرے پاس رہو۔ میرے سامنے رہو اور کچھ نہیں مانگتی میں“

”نہیں نہیں،“ وہ چلایا ”میں اپنی زندگی ختم کروں گا۔ اگر تم سے محبت نہیں کر سکتا تو دنیا بیچ ہے بیچ ہے“

”محبت اسے نہیں کہتے پگئے“ وہ بولی ”مجھے اس کی پروانیں مجھے کسی چیز کی پروا نہیں مجھے صرف ایلی چاہئے صرف ایلی،“ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرا۔

ایلی سکیاں بھرنے لگا ”تم اتنی حسین ہو تم اتنی پیاری ہو۔ دنیا تمہارے روپ و بیچ ہے شہزاد تم اتنی رنگیں ہو کہ تمہیں دیکھ کر میں نئے میں جھومنے لگتا ہوں۔ تمہیں محسوس کر کے میری کائنات بدلت جاتی ہے اور میں میں ایک ذیل نااہل شخص ہوں بیچ

ہوں“

”تمہیں کیا معلوم، وہ بولی“ تم کیا ہو چھوڑ واب معاف کر دو مجھے“ وہ ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے یوں ہاتھ جوڑے کھڑی دیکھ کروہ دیوانہواراٹھا اور شہزادکا بند بند چومنے لگا۔ جانو کے پاؤں کی چاپ سن کروہ الگ ہو گئی۔ اور کھڑکی میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے روزرازل سے وہاں کھڑی ہو۔ پھر جانو آتی تو شہزاد بولی“ کیا کر رہی ہے تو جانو کچھ خبر بھی ہے جبکہ لتنی محنت سے ایلی کوتلاش کر کے لائی ہوں اب اگر تو نے اس مہادیوی خاطر قوشخ ن کی تو یہ پھر روٹھو کر چلا جائے گا۔“

”مہادیو ہے مہادیو دیکھو“ جانو نے کہا“ فخر کرنا پھر تاہے اول تو گھر سے باہر نہیں لکھتا اور باہر نکل جائے تو پھر اس کا پتہ ہیں ہیں چلتا دیکھو تو چو ہے کی صورت“  
”اوہ ہوں ایسی باتیں نہ کر“ شہزاد نے جانو سے کہا“ تیری ایسی باتوں کی وجہ سے تو مارا خش ہوا تھا یہ“

”ہونہہ میری باتوں سے“ جانو چلائی“ میری باتوں سے جو ناراض ہوتا ہے تو پڑا ہو میں تو سچی بات کرنے سے نہیں چوکوں گی“

”اچھا بابا تو نہ چوک سچی بات کرنے سے پر اب تو جا کر چائے بنالا ساتھ پکجھ کھلا بھی دے۔ کیا یاد کریں گے جبکہ۔ کیا کھائے گا تو ایلی آج جومانگے گا ملے گا۔ پر چیز کھانے والی ہو“ اس نے اعلانیہ طور پر آنکھیں مٹکا کر کہا“ کیوں جانو ہے نا“ شہزاد نہیں

نہ میں نہیں سمجھتی تمہارے یہ اشارے اللہ ماری آنکھوں آنکھوں میں بات کہہ جاتی ہو مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ تو جانے اور تیرا ایلی جانے۔

”کیوں ایلی کیا جانے ہے تو“ شہزاد نے اس سے پوچھا“ اور جانو میں تو کچھ جانتی ہی نہیں جانتی تو تو ہے۔ جبکی تو تیرا نام جانو ہے، وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگی جانو ہنستی اور چلاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی

جانو کے جانے کے بعد شہزاد پھر اسی طرح ایلی سے دور بے نیاز بے خبر ہو کر بیٹھ گئی اور سلائیوں کے کام میں مصروف ہو گئی۔ اور ایلی دیوانوں کی طرح اس کی طرف ٹکلکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

### جوش رقابت

اگلے روز جب وہ دلوں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے بہت دور بیٹھے تھے تو شریف آگیا۔ شریف کو دیکھ کر ایلی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو وہ گھبرا کر اٹھا۔ بات کرنے کے لیے اسے الفاظ نہ ملتے تھے زبان میں گویا قوت ویاں مفتود ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بازوؤں کو کیسے سنبھالے جس لٹک کر گویا زمین سے جائے گے تھے اس نے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے بہت کم کوشش کی لیکن اس کی باچھوں پر گویا تالے لگئے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس حد تک کھل گئی تھیں کہ کوشش کے باوجود وہ انہیں قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں میں ایس آپ آپ یعنی میں ”اس نے شریف کے آنے پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔“

شہزاد اطمینان سے بیٹھی اپنی کام میں یوں مصروف رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے شریف کا آنایا نہ آنا۔ ایلی کا اس قدر قریب بیٹھے ہونایا نہ ہونا سب برادر ہو۔

”کیوں ایلی؟“ شریف نے کہا ”خوش ہوتم بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔ جانو ذرا حق تو بھرنا۔“

”چائے بھی تو بنادو جانا تو“ شہزاد بولی ”اور کھانا بھی تو کھائیں گے“ شریف نے بیک وقت متجمس اور مغموم نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ لیکن شہزاد اپنے کام میں مصروف تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے کھک جانا چاہئے اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کے گھر میں محسوس کیا جیسے اس کی حیثیت جملہ مغزضہ

کی ہو۔ کچھ دیر وہ وہاں بادل ناخواستہ بیٹھا رہا پھر اٹھا ”ابھی آؤں گا“ وہ بولا ”ذرا گھر سے ہو آؤں“

”اچھا“ شریف نے جواب دیا ”لیکن آنا ضرور تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں“ ایلی نے سوچا اس نے محسوس کیا جیسے شریف صورت حالات سے پورے طور پر واقف ہے جسے اسے علم ہو کہ ایلی وہاں کیوں آتا ہے اور اس نے اسی بارے میں باتیں کرنی ہیں



گھر پہنچ کروہ دھڑام سے چار پائی پر لگ پڑا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ باجرہ دوڑتی ہوئی آئی ”خیر قہبہ پھر کوئی بات تو نہیں ہو گئی“

”بات کیا ہوئی ہے؟“ فرحت نے نہیں کہا ”گھروانے اپنے گھر آگئے اور کیا“

”کیا مطلب ہے تیرافرحت؟“ باجرہ نے پوچھا

”شریف چھٹی لے کر آیا ہے اور کیا“ فرحت بولی

”ہا کمیں شریف آیا ہے“ باجرہ نے حیرانی سے دہرایا ”لیکن اس میں کیا ہے؟“

”پوچھو یا لی سے“ وہ بولی ”آخر اس نے تو گھر آنا ہی ہوا“

اس وقت ایلی اس قدر گھبرا یا ہوا تھا کہ اس نے فرحت کی بات کا برآندہ مانا اس وقت کی عجیب کیفیت تھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شریف کی آمد پر اسے دکھ کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ شریف کو تو وہ بہت اچھا سمجھتا تھا وہ تو ایلی کا پیارا دوست تھا پھر اس کی آمد اس قدر ناگوار کیوں ہو رہی تھی خواہ مخواہ غصہ کیوں آ رہا تھا۔ وہ رنگیں دنیا دفتا ویران کیوں ہو گئی تھی۔ دیر تک وہ چار پائی پر پڑا کروٹیں لیتا رہا پھر میرھیوں میں چھمن چھمن کی آواز سن کر چونکا۔

”ایلی کہاں ہے؟“ شہزاد محسنم بنتی ہوئی سامنے کھڑی تھی

اسے اکیلا دیکھ کر وہ بولی ”تم بھاگ کیوں آئے خواہ مخواہ چلے آئے واہ یوں کسی کو اکیلانہیں چھوڑا کرتے چل اٹھو“

”میں نہیں جاتا“ وہ منہ بنا کر بولا

”کیسے نہیں جاتے؟ اس نے اس کے گال سہلاتے ہوئے کہا

”نہیں جاتا“ وہ غصے میں اس کا باتھ جھٹک کر بولا ”تم جاؤ اپنے میاں کا دل بھلاو جا کر میں آؤں یا نہ آؤں تمہیں کیا پڑی ہے۔

”اوہ“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی ”تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی میرا اپنے کام کوئی آئے یا جائے مجھے کیا“

”پاگل ہو گئی ہو، وہ ترپ کرا شو بیٹھا“ یہ سب لوگ کیا کہیں گے،

”پڑے کہیں“ وہ بولی ”مجھے نہیں پروا۔“

”میاں سے پٹوگی تم“ ایلی نے مصنوعی غصے سے کہا اگر چہ شہزادی کی باتیں سن کر اسے ایک ان جانی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی خاطر شہزادی بھی کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ دنیا بھر سے جنگ کرنے کے لپے تیار تھی۔

”پونگی“، ”وہ چلائی“ مجھے کون پہیٹ سکتا ہے جی، ”وہ تمسخر سے بولی“ وہ بیجا را کیا

کرے گا اس کی کیا مجال ہے چلو انھوں نہ ہو۔

”ورنہ کیا؟“ ملی نے ابو حجا

”ورش میک ایگو سینه لیٹ جاؤ ایگا تمہار۔ ساتھ

لے لیا گھم اکے اٹھے عیناً ”لگ

”کون ہو گائے مالگل،“ فرحت نے داخل ہوتے ہوئے اپو جھا

”میں اور کون“ شہزادے نے جواب دیا ”تم سب تو سیانیاں ہو پا گل تو ایک میں ہی ہوں گا“

”کیوں ہوتی ہو یا گل، فرحت یوں!“ حکیم نے کہا ہے کیا؟“

”حکیم نے تو نہیں کہا،“ وہ اٹھ کر بولی ”البیت تم اے سانوں کو دلکھ کر جی جاہتا ہے

پاگل ہو کر کہیں نکل جاؤں،"

شہزادے کے انداز تکم میں غصب کی دھار تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم قبسم تھا ”اب آؤ گے بھی یا نہیں“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی ”اب آجھی جاؤ وہ انتظار کر رہے ہیں چائے سامنے رکھی ہے تھندی ہو جائے گی“

ایلی وہاں پہنچا تو شریف چائے کا پیالہ سامنے رکھے اسی طرح چھت کی طرف گلکلی باندھے بیٹھا تھا۔ ایلی کو دیکھ کا اس نے اپنی مخصوص حسرت زدہ سکراہٹ سے کہا ”نہ جانے کیا بات ہے جسے چاہو وہی دور بھاگتا ہے۔ اب یہ ایلی بھی محبوب سے خرے کرنے لگا۔ اپنی قیمت ہی ایلی ہے۔“

”نہیں نہیں“ ایلی چال لیا ”میں اور یاں“

### انوکھے اظہار

”اب چھوڑوان بہانوں کو“ شریف نے کہا ”یہ بانہنے اپنے لئے نئی چیز نہیں تم سے کچھ طبیعت ملی تھی سوچا تھا خوب گزرے گی جو مل دیکھیں گے لیکن اب تم بھی کافی کترانے لگے۔ ہاں یا دآیا۔ یہ تو بتاؤ امر تروالی کا کیا حال ہے کچھ بات بنی یا نہیں۔ اسے علم ہوا یا نہیں۔ کیوں نہ ہو گا علم محبت اثر کیے بغیر رہ سکتی ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی طاقت نہیں تو بتاؤ نہیں۔ کیا وہ بھی مضطرب ہے کیا اسے بھی خیال ہے۔ ضرور ہو گا لیکن اس کا اظہار بھی ہوا ہے یا نہیں تمہارے جذبے کی آزمائش ہے ایلی دیکھیں تمہارے جذبے میں کتنا اثر ہے“ ایلی کو خاموش دیکھ کر شریف نے کبوتر کی سی آنکھیں بناتے ہوئے کہا ”کیوں تمہیں تو معلوم ہے کچھ“ اس نے شہزادے سے مخاطب ہو کر پوچھا

”سارے محلے میں چرچا ہے“ شہزادے بولی ”سناء ہے حسن میں جواب نہیں اس کا جھبھی تو اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ دیکھو تو اس کی طرف مجھ سے کہتا تھا“ وہ ہنسی بے تحاشہ ہنستی چلی گئی ”مجھ سے کہتا تھا کہ زہر کھالوں گا“ ایلی نے غصے سے شہزادے کی

طرف دیکھا۔

”اب دیکھے لیجئے کیسے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ پر ایمان سے کہنا ایلی تم نے کہا  
نہیں تھا مجھ سے میں زہر کھالوں گا۔“

ایلی جیرانی سے شہزادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے با کی دیکھ کروہ گویا  
سکتے میں آ گیا تھا۔

”اوہبُوں، شریفِ مسکرا لیا۔“ زہر کھانا مردوں کا کام نہیں،“

”یہی میں نے اس سے کہا تھا،“ شہزاد قہقہہ مار کر فسی۔ لیکن یہ کہتا ہے میں مرد  
نہیں۔ کوئی پوچھئے کیسے نہیں نہیں تو مرد بھتی ہوں اللہ ہے،“

”زہر کھانا یا مرجان مردوں کا کام نہیں،“ شریف بولا۔ میری طرف دیکھو جی رہا ہوں۔  
اتنا کچھ جھیل کر بھی جی رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ اس کا بھی خیال ہے تمہارا یہ نہیں،“

شہزاد نے پھر قہقہہ لگایا۔ وہ امرتی ہے۔ وہ بولی ”اسی کو یقین نہیں آتا یہ سمجھتا ہے  
کہ اسے ذرا بھی پرواہ نہیں۔ اب وہ بیچاری کیا کرے؟“

”کیوں ایلی،“ شریف نے پوچھا

ایلی شہزادی دودھاری باتوں پر پیش میں آ رہا تھا۔ لیکن ان باتوں میں جو کتنا یہ کی  
مدد سے ایلی سے کی جا رہی تھیں ایک عجیب سی لذت تھی

”کیوں مذاق کر رہی ہیں آپ،“ ایلی نے شہزاد کو گھورا

”مذاق،“ وہ بولی ”اب میں تمہیں کیسے یقین دلاوں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی  
اس قدر سنجیدگی سے بات نہیں کی۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہیں یقین نہیں آتا اب میں کیا  
کروں،“ شہزادی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایلی گھبرا گیا۔ وہ شریف کی موجودگی  
میں برآہ راست اس سے وہ وہ باتیں کر رہی تھی جو اس نے ایلی سے کبھی تخلیے میں بھی  
نہ کی تھیں۔

اور شریف بھولا بھالا شریف مسکرا رہا تھا۔ ٹھیک کہتی ہے یہ، وہ شہزادی کی طرف

اشارہ کر کے کہہ رہا تھا ”ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے دوسرے کی بات کا یقین نہیں آتا، بس ایلی کو یقین ہی نہیں آتا“ شہزادیوں ”اب میں کیسے یقین دلاوں اسے ”ہاں ہاں“ شریف نے کہا پھر اس نے آہ بھری لیکن وہ بولا ”جب عشق پرانا ہو جاتا ہے تو پھر دنیا ہی بدلتی ہے نہ شکوہ نہ گلدن بے یقین“ ”نہ جانے وہ دن کب آئے گا“ شہزاد نے حضرت ناک آواز میں کہا ”کب آئے گا؟“ شریف چونک پڑا پھر آپ ہی آپ ہیں گربولا“ اچھا تو تم ایلی کے متعلق کہہ رہی ہو میں تھجھا“ وہ خاموش ہو گیا۔ ”اور کیا آپ کے متعلق کہہ رہی ہوں“ شہزاد قہقہہ مار کر بولی اس کی بات اور انداز دونوں میں بلا کی تحقیر تھی ایلی کا نیپ گیا۔

شہزاد اس کے نزدیک ایک معتمد تھی اس میں بلا کی جرأت تھی اور وہ بات اعلانیہ کرنے سے اچکچاتی نہ تھی اور سب سے عجیب ترین بات یہ تھی کہ کسی تیرے آدمی کی موجودگی میں وہ ایلی سے اس قدر قریب ہو جاتی تھی جیسے اس کی گود میں بیٹھی ہو۔ اس کے اشارات کس قدر واضح اور نگلین ہوتے تھے اس کی حرکات سے محبت آمیز شرارت یا شراحت آمیز محبت پلکتی تھی لیکن تنہائی میں اس کا انداز قطعی طور پر بدلتا تھا جیسے وہ ایلی کے وجود ہی سے منکر ہو۔ اس کے خدوخال پر سر دھری کا دیز پر دہ پڑ جاتا اور اس کا حسن بے جان ہو کر رہ جاتا تھا۔ رات کو جب ایلی اپنے بستر پر پڑا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل کر شریف کو دھوکا دے رہے ہیں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اور معصوم اور پیارا شریف بے خبری میں دھوکہ کھانے جا رہا ہے وہ دونوں کے ایک دوسرے سے اظہار محبت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ایلی کو یہ بتیں سوچ کر دکھ ہو رہا تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک مجرم ہے۔ اسے شریف سے ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی جب اسے یہ خیال آتا کہ شریف اس وقت شہزاد کے قریب بیٹھا ہو گا۔ وہ اس سے اظہار محبت کر رہا ہو گا اور شہزاد اپنے خاوند کی آمد پر شوق محبت سے بنتا ب

ہوئی جا رہی ہو گی تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور اسے شریف سے نفرت ہونے لگتی ”لا حول ولا قوۃ کیا بیہودہ آدمی ہے بے وقوف جس کے منہ سے ہر وقت رال پکھتی ہے۔ جو ہر وقت کبوتر کی طرح آنکھیں بنائے چھپت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ جو شہزادی رنگین شخصیت کے قریب بیٹھے کر کسی گذشتہ عشق کی محرومی پر آہیں بھرتا رہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ شہزاد کے قابل نہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی اور موت کی طرح وہ دونوں متفاہد چیزیں ہیں شہزاد زندگی ہے رنگینی ہے اور شیرف مایوسی حسرت اور موت“، لیکن اس کے بعد اسے خیال آتا ”شہزاد اسے کیسے برداشت کر سکتی ہے کیوں برداشت کرتی ہے“ پھر اسے شہزاد کے خلاف غصہ آنا شروع ہو جاتا اور اس کے تخلیں میں شہزاد اور شریف کے قرب کی عجیب تصاویر تصسیل کر دیں اور دل میں رقابت کی جلن محسوس ہوتی۔

### کروٹیں

اس روز وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ جب بھی وہ سونے لگتا یا جب بھی اس کی آنکھ لگتی تو گویا کوئی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا ”اظھووہ“ قریب آرہے ہیں ایک دوسرے کے قریب“ وہ چونک کراٹھو بیٹھتا اس کے ذہن کی چادر پر پھر سے تصاویر متحرک ہو جاتیں۔ شہزاد برہنہ حالت میں آکھڑی ہوتی اس کا چہرہ خواہش کی شدت سے بھیانک ہو رہا ہوتا اس کا جسم غلاظت کے کیڑے کی طرح گندگی کی طرف رینگتا۔ اس کی آنکھوں میں عریاں شعلے لپکتے۔ اور وہ شریف کی طرف بڑھتی جاتی۔ ایلی کے دل میں درد بھری ٹھیسیں اٹھتیں اور وہ بے تاب ہو کر تڑپتا۔

ساری رات وہ پہلو بدلتا رہا ساری رات وہ تڑپتا رہا۔ رقابت اور تکلیف کا یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ نیا اور بے حد تکلیف وہ اگلے روز جب شہزاد اسے بلا نے آئی تو ایلی نے خشک انداز میں جواب دیا ”تم جاؤ میں پہنچ جاؤں گا“

لیکن شہزادے اصرار کیا ”میں تو ضرور ساتھ لے کر جاؤں گی کوئی بات ہے۔ تمہارا کیا اعتبار بات کر کے مکر جاؤ“، شہزادے اس بات پر اس قدر ہنگامہ مچایا کہ ہاجرہ کے اصرار پر ایلی کو جانا ہی پڑا۔

”سیڑھیوں میں جوب وہ اکٹھے تھے تو شہزادے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور وہ بولی“  
پارہ بہت چڑھا ہوا ہے آج۔“

”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ“، ایلی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا

”کیوں کیا ہے اس ہاتھ کو، شہزادے بولی

”اس ہاتھ سے شریف کے منہ کی رال کی بوالتی ہے“، وہ بے پرواںی سے بولا

”شریف کے منہ کی رال ہونہہ، وہ فرشت سے کہنے لگی“، تم نے کیا سمجھا ہے مجھے،“

”کیا ہوم“، ایلی نے پوچھا

”میں میں ہوں“، وہ سینئنٹان کر بولی

”اور وہ تمہارا خاوند ہے نا“، ایلی نے جواب دیا

”ہو گا“، وہ بولی ”پڑا ہواس سے کیا فرق پڑتا ہے“

”رات بھر محفل گرم رہتی ہے“، ایلی نے کہا

”ہونہہ محفل گرم رہتی ہے“، وہ بولی ”وہ بیچارہ کیا محفل گرم کرے گا“، تو تم کرتی ہو گی ایلی نے کہا

”کبھی کروں گی ہی نا“، شہزادے آہ بھر کر کہا دیکھ ایلی میری بات سن شہزادے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر کہا ”کسی کو مجال نہیں ہے جو مجھے ہاتھ لگائے تم تو ناقص جلتے ہو“

”لیکن وہ تمہارا مالک ہے۔ تمہیں ہاتھ لگانے کے لیے ہی چھٹی لے کر آیا ہے۔ تم سے ملنے کے لیے تمہاری آرزو لیئے“، وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی ”چلو چل کر مالک کی شکل و صورت دیکھ لو پہلے“، یہ کہہ کر نہستی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

”معلوم ہوتا ہے“ شریف نے ایلی سے مخاطب ہو کر پوچھا ”اب تمہیں میرا خیال نہیں رہا مجھ سے محبت نہیں رہی کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ ہماری قسمت میں تو انتظار کرنا ہی لکھا ہے“ نہ جانے کیوں شریف نے یعنی نگاہوں سے شہزادی کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت یوں مشین پر بیٹھی کام میں مصروف ہو چکی تھی جیسے گرد و پیش کے متعلق کچھ خبر ہی نہ ہو“ یہ بھی باہر جا کر ہی بستی ہے“ شریف نے شہزادی کی طرف اشارہ کیا ”ہمارے ساتھ کوئی بھی نہیں ملتا“

”روتوں کے ساتھ لوں نہیں“ شہزادی بولی ”عن الہ ہے ہوا یلی حق کہہ رہی ہوں نا“ ”یہ بھی ٹھیک ہے“ شریف نے آہ بھر کر کہا رتوں کے ساتھ کون نہیں“ چلو نہ فسور پر روتنے کو سلی تو دواں کے آنسو تو پوچھو اس سے ہمدردی تو کرو“

”نہ جی“ شہزادی بولی ”یہ پیغم خانہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ہر وقت رتوں کو چپ کراتے رہیں۔“

”سن لیا تم نے“ شریف نے ایلی سے کہا ”یہی خوش نہ ہو سکی تو کس کو خوش کر سکتا ہوں میں۔ اپنے اپنے نصیب ہیں بھائی۔ تم پر امید باندھی تھی تم نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا صبح سے بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کب ایلی آئے۔ شاید تمہارا بھی میرے پاس بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہاں بھی ٹھیک تو ہے ہری کو پلیں سو کھے چوں سے کیسے لگا ورکھیں۔ ہم تو اب سو کھے پتے سے بھی بدتر ہو چکے۔“ اس نے پھر سے چھٹ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اور باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے رال کے تار لٹکنے لگے۔

شریف نے سخنڈی آہ بھری ”کبھی ہم بھی ہری کو نہیں تھے کبھی ہم میں بھی زندگی تھی۔ لیکن زمانے نے وفا نہ کی۔ محبت را س نہ آئی لوگ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ دو محبت کرنے والے ملیں۔ زمانے کا رنگ ہی ایسا ہے لیکن“ وہ یک دم جلال میں آگیا ”وہ محبت کو زندگی سے خارج نہیں کر سکتے

صرف محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں لگوں کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ کیوں ایلی ٹھیک ہے؟ ”شریف نے مسکرا کر ایلی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”تم بھی ان سے ڈرنا نہیں۔ ان کی پرواہ کرنا۔ اپنے آپ میں جرأت پیدا کرنا سچائی میں جرأت ہوتی ہے ایلی؟“

”نہ“ شہزادیوں کا تو ڈر ڈر کر برحال ہو رہا ہے۔ اس سے دلیری کی امید رکھنا لاحصل ہے، شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی ”کیوں ایلی ٹھیک کہتی ہے یہ تم ذر جاگے کیا؟“ شریف نے پوچھا ”میں میں“ ایلی تھیڑا گیا۔

”لو دیکھ لو، شہزاد بنسی“ یہ آخرتی بات پر گھبرا جاتا ہے۔“

شریف نے شہزاد کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ”لیکن یہ بتاؤ ایلی کیا اسے تمہاری پرواہ ہے؟ یہی ہے وہ۔“

”وہ“ ایلی نے دہرایا۔ اور پھر پہلی مرتبہ اس نے جرأت سے کہا ”اتنی رنگیں ہے وہ، وہ معنی خیز نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا“

”اتنی رنگیں ہے اتنی شوخ ہے اتنی پیاری ہے کہ میں کیا بتاؤں“

”لیکن کیا وفا دار بھی ہے یا نہیں؟“ شریف نے پوچھا

”وفاوار“ ایلی نے پھر شرارت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہ بھر کر بولا“ پیاریوں میں وفا کب ہوتی ہے وہ تو بے نیاز ہے۔ بلند و بالا جو ہوئی۔ وہ بیچاری وفا کیا جائے؟“

”جھوٹ“ اتنی وفا ہے اس میں ”شہزاد مشین چلاتے ہوئے کہا“ کہ کیا بتاؤں

”تم کیسے جانتی ہو شریف بولا“ خواہ مخواہ“

”واہ میں نہیں جانتی تو کون جانتا ہے؟“ وہ قہقہہ مار کر بولی ”وہ تو“

”لیکن“ ایلی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

ایلی کے لیے وہ سلسلہ گفتگوں قابل برداشت اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ براہ راست محبت کی باقی کر رہے تھے عہدو پیاس کر رہے تھے اور وہ پردہ جس کے تلے انہوں نے اپنے جذبات کا چھپایا ہوا تھا۔ ہر ساعت باریک سے باریک تر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن بات کاٹنے کے بعد وہ گھبرا گیا اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے

پھر گھبراہٹ میں اس کے منہ سے انکل کیا۔ لیکن مجھ میں کوئی خوبی ہے کہ وہ مجھ سے وفا کرے۔ میری ٹکل و صورت ملاحظہ ہو۔

شہزادہ نس پڑی۔ ”بھی عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں“، وہ بولی۔ وہ ٹکل و صورت نہیں جانتیں خوبیاں نہیں تلاش کرتیں۔ بھجوں لوچھس جاتی ہیں اور بس پھنس گئی تو پھر کن کیما۔“ وہ بُنی اور پھر بولی۔ ”اور پھنس جائیں۔ ایک بار تو پھر باہر لکھنا پسند نہیں کرتیں۔“ عورتوں کا کیا ہے،“ شہزادے آہ بھر کر کہا۔ ”ڈٹ جائیں تو دنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اُوں کو چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں۔ تو نالی کے کنارے بیٹھ کرو دیتی ہیں۔“

”بڑی سیانی ہو گئی ہوتی“، شریف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ایلی کے لیے اس موضوع پر بات کرنا بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کا پیانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ شہزادہ کی ہربات ہر حرکت واضح طور پر ایلی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ اس قدر اشارات واضح ہو چکے تھے۔ ایلی گھبرا کر انٹھ بیٹھا۔

”اچھا میں اب چلتا ہوں“، وہ بولا۔ ”مجھے ارجمند کی طرف جانا ہے وہ آج واپس جا رہا ہے اس کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اسے مل کرو واپس آؤں گا۔“

”کب آؤ گے؟“، شریف نے پوچھا

”اور اگر نہ آئے،“ شہزادہ بولی۔ ”تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے سنام نے۔“ میرھیاں اترتے ہوئے ایلی سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ ارجمند نے واقعی اس روز

علی اپر سے جانا تھا۔ اور اس نے ایلی سے تاکید کی تھی کہ اسے ملے۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں عجیب و غریب جذبات چھلک رہے تھے۔ شہزادی کی ایک ایک بات جو اس نے اشارتاً اس سے کی تھی اس کے دل میں طوفان بن کر کھول رہی تھی۔ دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی دیرانے میں جا کر رودے۔ کسی کھیت میں اوندھے منہ پڑ کر چینیں مارے۔ حتیٰ کہ شام ہو جائے اور پھر رات کے اندر ہیرے میں چکے سے چار پالی پر پڑ کر شہزادی کے تصور میں اپنا آپ کھو دے۔ اسے واقعی شہزادی سے محبت ہو چکی تھی۔

وہ سلسہ جو مخفی ایک تفریقی حرکت سے شروع ہوا تھا ایک عظیم جذبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یا تو اپنے اس خود ساختہ اخبار کو جذبہ بات کی بھی میں ڈال کر ایلی نے اسے اس قدر آگ دکھائی تھی کہ وہ واقعی لندن میں چکا تھا۔ اور یا شہزادی کی رنگینی نے اس کے کردار کی عظمت میں شامل ہو کر شہزادی کی کشش کو ہزاروں گناہ بڑھا دیا تھا۔ اور اب وہ سچے دل سے اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ بہر حال حقیقت چاہے کچھ بھی ہوا اس کے دل میں شہزادی کے لیے جذبات کا ایک سمندر کھول رہا تھا۔

### بجھتا دینیپ

جب وہ ارجمند کی گلی میں پہنچا تو ارجمند سوت کیس ہاتھ میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا اور اس کی ماں اس کے قریب کھڑی آنسو پوچھ رہی تھی۔

”آگئے تم“، ارجمند اسے دیکھ کر بولا ”چلو آتو گئے“ وہ حسرت آلو مسکراہٹ سے بولا ”انتا کرم کیا کم ہے۔ نہ آتے تو اپن کیا کر لیتے تمہارا کیوں ماں“ پھر اسے کہانی کا دروازہ پڑ گیا اور وہ دیوار سے سہارا لے کر کھانے لگا

”آخر تم جاتے ہی کیوں ہو“ ارجمند کی ماں نے روئے ہوئے کہا ”چھٹی تو نہیں ملتی تو چھوڑ دو نوکری کو اے ہے جان ہے تو جہاں ہے جان ہی نہ ہوئی تو نوکری کو کیا کرنا ہے۔“